# جندر

(ناول)

اختر رضا سلیمی

# جندر (ناول)

اختر رضا سلیمی

ہر و بغتی سی اندر مھاڑے

ہنڑ تے ہئی گے جندر مھاڑے

ہر پاسے پرچھاواں مھاڑا

اَج ویٖنھ ڈُبیا اندر مھاڑے

(اختر رضا سلیمی)

# جندر

(ناول)

اختر رضا سلیمی

| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | : | جندر |
| مصنف | : | اختر رضا سلیمی |
| اہتمام | : | ارشد ملک |
| اشاعت اول | : | اکتوبر 2017 |
| اشاعت دوم | | جولائی 2018 |
| تعداد کتب | : | 1000 |
| کمپوزنگ | : | عابد محمود |
| ٹائٹل | : | سجاد احمد |
| مطبع | : | |

## قیمت: 200 روپے


ادارہ ایسی کتب کی اشاعت کرتا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اشاعتِ کتب کا مقصد کسی کی دل آزاری یا ضرر رسانی نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو ازراہِ کرم مطلع فرمائیں۔ انشاءاللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائے گا۔ (ادارہ)

## وصی حیدر کے نام

ٹک دیکھ نہیں تو بہت افسوس رہے گا
ہم لوگ گزرتے ہوئے منظر کی طرح ہیں

۱

مجھے یقین ہے کہ جب پو پھٹے گی اور روشنی کی کرنیں دروازے کی درزوں سے اندر جھانکیں گی تو پانی سر سے گزر چکا ہوگا اور میری سانسوں کا زیر و بم، جو اس وقت جندر کی کوک اور ندی کے شور سے مل کر ایک کرب آمیز سماں باندھ رہا ہے، کائنات کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہو چکا ہوگا اور پیچھے صرف بہتے پانی کا شور اور جندر کی اداس کوک ہی رہ جائے گی؛ جو اس وقت تک سنائی دیتی رہے گی جب تک جندر کے پچھواڑے موجود، معدوم ہوتے راستے پر سے گزرتے ہوئے، کسی شخص کو اچانک میرا خیال نہ آ جائے اور وہ یوں ہی بغیر کسی پیشگی منصوبے کے، محض میرا اتا پتا کرنے، جندر کے صحن کو اس اجاڑ راستے سے ملانے والے، سات قدمی زینے پر سے اترتا ہوا جندر کے دروازے تک نہ آ جائے۔ یہ دروازہ، جسے میں رات کو سونے سے پہلے ہمیشہ اندر سے کنڈی لگا دیا کرتا تھا؛ آج اسے بند کرتے ہوئے میں نے احتیاطاً کنڈی نہیں لگائی؛ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ آج میری زندگی کی آخری رات ہے اور میرے بعد اسے، کسی مانوس یا ان جانی دستک پر، اندر سے کھولنے والا کوئی نہیں ہوگا۔

میرے بعد یہاں آنے والا پہلا شخص کون ہوگا؟

یہ سوال میرے ذہن میں پہلی بار آج سے پینتالیس دن پہلے اس وقت ابھرا تھا، جب میں نے اپنی اور جندر دونوں کی زندگی کی آخری چونگ پیس کر، گھومتے پاٹ کے ساتھ لگی لکڑی کی وہ کیل کھینچی تھی، جس کے کھینچنے سے جندر کا اوپر والا پاٹ، اپنی جگہ سے تھوڑا سا اوپر اٹھ کر معمول

سے دوگنی رفتار میں گھومنا شروع کر دیتا ہے اور اس کی سریلی گونج یک دم ایک اداس کوک میں بدل جاتی ہے۔ اگر چہ پچھلے چار پانچ ماہ سے جندر پر آنے والی چونگیں بہ تدریج کم ہوتی چلی گئی تھیں اور اس دوران میں کچھ دن تو ایسے بھی آئے کہ سارا سارا دن کوئی چونگ نہیں آئی اور جندر کا اوپر والا پاٹ اپنی معمول سے دوگنی رفتار میں گھومتا؛ اپنے پاٹ گھساتا اور میرے وجود میں لگی کرب کی دیمک کو مزید رزق فراہم کرتا رہتا۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے اندر کے سناٹے سے ایک ایسی آواز، جسے میں کانوں سے نہیں دل کے وسیلے سے سنتا، مسلسل آتی رہتی تھی کہ چونگوں کا یہ تعطل عارضی ہے۔ اب اسے اتفاق کہیے یا میری پیش بینی کی صلاحیت کہ میں جیسا سوچتا، ویسا ہی ہوتا؛ ایک دو دن بعد ایک مرتبہ پھر کوئی نہ کوئی چونگ آجاتی اور میں اسے جندر کے کھارے میں انڈیل کر جوں ہی لکڑی کی کیل نیچے گراتا؛ جندر کی اداس کوک، سریلی گونج میں تبدیل ہو جاتی اور میرے مضمحل بدن میں سیروں خون دوڑ جاتا۔ ابھی میں اسے پیس ہی رہا ہوتا کہ کوئی نہ کوئی اور چونگ بھی آجاتی اور ایک مرتبہ پھر یہ سلسلہ بحال ہو جاتا۔

لیکن پینتالیس دن پہلے کی، جس اداس شام کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس دن آخری چونگ پیس کر، پسا ہوا آٹا سمیٹ کر بوری میں ڈالنے کے لیے، میں نے بوری کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنی اور جندر دونوں کی زندگی کی آخری چونگ پیس چکا ہوں؛ پھر جوں ہی میں نے لکڑی کی کیل کھینچی اور جندر کی سریلی گونج اداس کوک میں تبدیل ہوئی مجھے اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ موت، جسے میری پیدائش کے ساتھ ہی میرے وجود میں رکھ دیا گیا تھا، اور جو کچھ روز پہلے تک مجھے بہت دور سے آنے والی آوازوں جیسی لگتی تھی عنقریب میرا کام تمام کرنے والی ہے۔ تب یہ خیال کہ میرے بعد یہاں آنے والا پہلا شخص کون ہو گا، بجلی کے ایک کوندے کی طرح میرے دماغ میں لپکا تھا اور اگلے ہی لمحے میری آنکھوں کے سامنے کئی انسانی چہروں کے خد و خال آپس میں یوں گڈمڈ ہوئے تھے کہ میں کسی بھی چہرے کو اپنے دماغ میں تصویر نہیں کر پایا تھا۔ اگر میں اپنے گزشتہ تجربے کو مد نظر رکھتے ہوئے فہم عامہ کا سہارا لیتا تو میرے پاس

ایسا سوچنے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی لیکن اس روز جب میرے اندر کے سناٹے کو کسی آواز نے نہیں پاٹا تو میں سمجھ گیا کہ میں اپنی اور جندر دونوں کی زندگی کی آخری چونگ پیس چکا ہوں ۔اس دن زندگی میں پہلی بار یہ راز مجھ پر منکشف ہوا کہ ذہن میں آنے والے کسی خیال کو نہ تو روکا جا سکتا ہے اور نہ ہی بدلا ۔البتہ میں،اس بارے میں، کچھ نہیں کہہ سکتا کہ آیا میری سوچ نے چونگیں لے کر آنے والوں کے رخ تبدیل کر دیے تھے یا ان کے تبدیل شدہ رخوں کو میری پیش بینی کی صلاحیت نے پہلے ہی بھانپ لیا تھا۔

میں نے اپنے بچپن میں بزرگوں سے سنا تھا اور اب گزشتہ پینتالیس دنوں سے ہر لمحے خود بھی اس تجربے سے گزر رہا ہوں کہ جب آدمی مرنے کے قریب ہوتا ہے تو اس کے وہ خفتہ حواس جنھیں اس نے ساری زندگی کام میں نہیں لایا ہوتا،موت کی آہٹ سے جاگ اُٹھتے ہیں اور اسے اپنی موت کے حوالے سے پیش آمدہ حالات کی خبر پہلے ہی سے ہو جاتی ہے لیکن اپنی موت کے بعد رونما ہونے والے واقعات کے بارے میں وہ صرف اندازے ہی لگا سکتا ہے۔یہی وجہ ہے گزشتہ پینتالیس دنوں میں، جب سے میں اپنی ماں اور موت دونوں کا ہاتھ اپنے شانوں پر محسوس کر رہا ہوں، میں نے اپنی موت کے بارے میں اتنا نہیں سوچا جتنا کہ اس آدمی کے بارے میں، جو میرے بعد یہاں ــــــــ اس ویران جندر پر ــــــــ آنے والا پہلا شخص ہوگا۔وہ کون ہوگا ؟ اتنے دنوں کی سوچ بچار کے بعد بھی میں،اس بارے میں، کچھ وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ہاں یہ بات میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ میرا بیٹا راحیل نہیں ہوگا کہ گزشتہ قاعدے کے مطابق اب اس کی واپسی جون میں ہونا تھی؛یعنی تقریباً ساڑھے تین ماہ بعد۔

ابھی دو ماہ پہلے دسمبر کے تیسرے ہفتے میں جب وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گاؤں آیا تھا تو کچھ دیر کے لیے میرے ہاں بھی چلا آیا تھا اور یہاں اسی کھائی کنارے، جہاں میں ابھی لیٹا ہوا دھیرے دھیرے موت کی کھائی میں اتر رہا ہوں، یوں سر جھکائے بیٹھا رہا تھا جیسے اسے ایک جندروئی کے بیٹا ہونے پر شرمندگی ہو۔جب وہ جانے لگا تھا تو اس نے حسبِ روایت میری جیب

میں کچھ روپے بھی ٹھونس دیے تھے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھے ان کی ضرورت نہیں ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جندر کی دہلیز پار کرتے ہوئے ، ہمیشہ کی طرح ،اس نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا تھا کہ اگر میں اس کے ساتھ شہر چلنا چاہوں تو اسے خوشی ہو گی؛ کاش وہ جان سکتا کہ میری خوشی یہیں رہنے میں ہے۔

وہ سال میں دو ہی مرتبہ گاؤں آتا تھا؛ جون اور دسمبر میں: جب اس کے بچوں کے سکول بند ہوتے اور وہ خود دفتر سے چند دنوں کی رخصت لے لیتا ۔ رخصت منظور ہوتے ہی وہ بیوی بچوں کو ساتھ لیتا اور آب و ہوا تبدیل کرنے یہاں آجاتا ۔ گاؤں آنے سے پہلے وہ گاؤں کی مرکزی مسجد کے خادم کو اطلاع کر دیتا، جو اس گھر کی، جس کے صحن میں اس کی ماں کی ڈولی اتری تھی اور جہاں اس نے بچپن کے دن گزارے تھے، صفائی ستھرائی کر دیتا تھا۔ گرمیوں میں تو وہ اٹھارہ بیس دن گاؤں میں گزارتا کہ معتدل موسم کے باعث اس کے بیوی بچے اپنا وقت یہاں ہنسی خوشی گزارنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ،لیکن سردیوں میں وہ محض چار پانچ ہی دن یہاں رکتا ہے کہ اس کے بیوی بچے یہاں کی شدید سردی زیادہ دن برداشت نہیں کرسکتے اور اس کے سر پر، ان کے بیمار ہونے کا خدشہ، ہر وقت منڈلاتا رہتا تھا۔ ہاں اگر ان دنوں برف پڑی ہوتی تو وہ اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک دو دن مزید بھی ٹھہر جاتے کہ جب تک برف باری کے بعد آسمان صاف نہ ہو اور راتوں کو پڑنے والی اوس ،مری اور گلیات کے پہاڑوں کی چوٹیوں سے آنے والی یخ بستہ ہوا سے مل کر برف پر کہرے کی وہ موٹی تہہ نہ جما دے، جو اسے سخت کر دیتی ہے سردی کا احساس نہیں ہوتا؛ لیکن اب یہاں برف بھی تو اتنی ہی پڑتی ہے کہ ایک دو دن ہی میں پگھل کر کچھ تو زمین ہی میں جذب ہو جاتی ہے اور کچھ جھرنوں ،چشموں ، آبشاروں اور چھوٹے نالوں سے ہوتی ہوئی اس ندی کے پانی میں آملتی ہے ،جس میں میرا یہ جندر اس وقت کوک رہا ہے۔ ستر سال سے اوپر کا ہونے کے باوجود میں کبھی اس بات کا ٹھیک سے اندازہ نہیں لگا پایا کہ ایسے دنوں میں جندر کے بھاری پاٹوں کو گرمانے میں پگھلی ہوئی برف کا کتنا حصہ ہوتا ہے لیکن بہر

حال ہونا ضرور ہے۔

اس بار، چوں کہ برف باری دسمبر کے پہلے ہی ہفتے میں ہوگئی تھی اور اس کے بچوں کو سردیوں کی چھٹیاں دسمبر کے تیسرے ہفتے میں ہوئیں اس لیے وہ برف سے لطف اندوز نہ ہو سکے اور گاؤں آنے کے بعد تیسرے ہی روز صبح سویرے واپس شہر چلے گئے کہ ان کے نازک بدن، برف ڈھلنے کے بعد پڑنے والی اس کہر کی شدت برداشت نہیں کر سکتے تھے، جو ٹھہرے ہوئے پانی پر شیشے کی ایک ایسی مضبوط تہہ جما دیتی ہے، جس پر پاؤں رکھ کر، میں اپنے بچپنے میں، اس کے نیچے موجود چھوٹی چھوٹی مچھلیاں دیکھا کرتا تھا۔

اب قاعدے کے مطابق اس کی اور اس کے بیوی بچوں کی آمد جون ہی میں ہونا تھی۔ یہاں سے واپسی پر، دونوں میاں بیوی نے یقیناً یہی منصوبہ بنایا ہوگا لیکن اب کی بار، ان کا یہ منصوبہ اس وقت دھرے کا دھرا رہ جائے گا؛ جب انھیں اطلاع ملے گی کہ میری موت واقع ہو چکی ہے۔ جب بذریعہ فون میرے بیٹے کو اس کے دفتر میں، میری موت کی اطلاع دی جائے گی تو وہ یقیناً دفتر کے ضروری معاملات نمٹا رہا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس وقت کسی اہم میٹنگ میں ہو اور اس کے ذاتی اسٹاف میں سے کوئی شخص اسے یہ اطلاع کاغذ پر لکھ کر بھجوائے اور اسے میٹنگ سے اٹھ کر آنا پڑے۔ بہر حال جیسے ہی اسے یہ اطلاع ملے گی وہ یک دم سکتے میں آ جائے گا، اس لیے نہیں کہ اس کے باپ کی موت واقع ہو چکی ہے بل کہ اس لیے کہ مجھے کفنانے دفنانے کے لیے اسے ہر حال میں یہاں آنا پڑے گا اور وہ بھی اپنے بیوی بچوں سمیت۔ سب سے پہلے وہ اس کی اطلاع اپنے باس کو دے گا، جو اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے، اس سے رسمی تعزیتی الفاظ کہے گا۔ پھر وہ فوراً اپنی بیوی کو فون کرے گا، جس پر یہ خبر بجلی بن کر گرے گی اور یہ سوچ کر، اس کا بلڈ پریشر یک دم ہائی ہو جائے گا کہ ابھی تو دو ماہ پہلے گاؤں سے ہو کر آئے ہیں اب پھر جانا پڑے گا اور پھر اس پر اٹھنے والے اخراجات اس پر مستزاد۔ اس کے گھر میں ایک ہنگامی حالت نافذ ہو جائے گی۔ بچوں کی اسکول سے غیر حاضری ایک الگ مسئلہ ہوگی کہ ان کے امتحانات بھی سر پر ہوں گے اور

ایسے دنوں میں انھیں اسکول سے چھٹی کرانا کسی صورت بھی ان کے مستقبل کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ پھر اس دشوار گزار پہاڑی راستے کے سفر کا تردد اور وہ بھی بغیر کسی پیشگی منصوبے کے۔ اس پر مستزاد یہ کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہر وقت غمگین رہنے کی اداکاری کرنا پڑے گی۔

اس کی بیوی کے لیے سب سے بڑا مسئلہ گاؤں کی وہ عورتیں ہوں گی، جن سے ملتے ہوئے اسے ہمیشہ گھن آتی تھی، لیکن اب تو اسے، ان سے بغل گیر ہو کر باقاعدہ بین بھی کرنے ہوں گے؛ اور ان کے جسموں سے آنے والی پسینے، گوبر اور نسوار کی بساند، اسے کئی دن تک چین سے سونے نہیں دے گی۔

ان کے بچے، جو یہاں آ کر انسانوں سے زیادہ پڑوسیوں کے ڈھور ڈنگروں سے گھل مل جاتے ہیں، اور بلی اور بکری وغیرہ کے بچوں کو تو پکڑ کر گود میں اٹھا لیتے ہیں، ان کے لیے الگ سے دردِ سر ہوں گے کہ اس مصنوعی سوگوار ماحول میں، جب کہ ان کے پاس کئی دنوں تک تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہے گا، ان پر کڑی نظر رکھنا ان کے لیے ناممکنات میں سے ہوگا۔ سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہوگی کہ اس کے دفتر کے وہ سنگی ساتھی، جنھیں مرعوب کرنے کے لیے اس نے اپنے باپ دادا کی داداگیری کے دلچسپ قصے سنائے ہوں گے اور وہ اس کی عزت اور توقیر ایک اعلیٰ افسر سے زیادہ ایک اعلیٰ حسب نسب رکھنے والی شخصیت کے طور پر کرتے رہے ہوں گے، اس کے نہ چاہتے ہوئے بھی تعزیت کے لیے یہاں آ جائیں گے اور وہ گاؤں والوں کی باتوں سے ______ جو دبے لفظوں میں پہلے ہی اسے، اس حوالے سے طعن لعن کرتے رہتے ہیں ______ کسی نہ کسی طرح تو جان ہی جائیں گے کہ اس کا باپ ایک جندروئی تھا اور اس کی موت یہاں بہنے والی ایک ندی کے ویران جندر میں انتہائی کس مپرسی کی حالت میں ہوئی۔ ممکن ہے ان میں سے کچھ لوگ تو جندر دیکھنے کی خواہش کا اظہار بھی کریں اور اس کے نہ چاہتے ہوئے بھی جائے وقوع پر پہنچ جائیں۔

اس صورت حال کا سامنا اسے کب کرنا پڑے گا، اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ کب

وہ پہلا شخص، جس نے گاؤں والوں کو میری سرد ہو چکی لاش کے بارے میں بتانا ہے، یہاں سے گزرتے ہوئے بغیر کسی پیشگی منصوبے کے، یوں ہی اتفاقاً میرا اتا پتا کرنے، جندر کے صحن کو، اس کے پچھواڑے سے گزرتے ہوئے اجاڑ رستے سے ملانے والے سات قدمی زینے پر سے اترتا ہوا، یہ دروازہ، جسے میں نے آج اندر سے کنڈی نہیں لگائی، کھولتا ہے اور مجھے مردہ حالت میں پاتا ہے۔ میں اس بارے میں کوئی قیاس آرائی نہیں کر سکتا کہ اُس وقت میری لاش کی حالت کیا ہو گی؟

ممکن ہے کل ہی یہاں سے گزرنے والے کسی شخص کو اچانک میرا خیال آجائے اور وہ جندر کے صحن میں اتر کر، دروازے سے اندر جھانکے اور میری لاش کو صحیح حالت میں پائے، اگر وہ پرسوں آیا تو بھی میری لاش صحیح سلامت ہی ہو گی کہ یہ آگ جو ابھی آتش دان میں بھڑک رہی ہے اور جس کے شعلوں سے نکلنے والی سپید و سرخ روشنی نے، میرے وجود سمیت، اس کمرے میں موجود ہر شے کو سائے کا اعتبار بخش رکھا ہے، میری موت واقع ہونے تک مکمل طور پر بجھ جائے گی اور یہ سردی، جو اس وقت ندی کے مرکزی بہاؤ سے ہٹ کر، راس میں موجود کھڈوں میں ٹھہرے پانی پر آہستہ آہستہ کہرے کی ایک موٹی تہہ جما رہی ہے، میری لاش کو کم از کم پچاس گھنٹے خراب ہونے سے بچائے رکھے گی۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ اگلے بیس دنوں میں بھی کوئی ایسا شخص یہاں سے نہ گزرے، جو اتفاقاً میرا اتا پتا کرنے جندر کے کمرے کی طرف آئے۔

پہلے تو میں نے کبھی غور نہیں کیا کہ ان لوگوں کو چھوڑ کر جو میرے ہاں دانے پسوانے آیا کرتے تھے، یہاں سے اور کون کون گزرتا ہے، لیکن گزشتہ پینتالیس دنوں سے چوں کہ میں اس ممکنہ آدمی کی تلاش میں ہوں، جس نے سب سے پہلے مجھے مردہ حالت میں پانا اور گاؤں والوں کو میری موت کے بارے میں بتانا ہے، اس لیے میں یہاں سے گزرنے والوں پر برابر نظر رکھے ہوئے ہوں۔ اس مشاہدے کی روشنی میں، مَیں نے اندازہ لگایا ہے کہ اس اجاڑ رستے سے اب دن میں بہ مشکل چار پانچ آدمی ہی گزرتے ہیں، جن میں سے کچھ تو بالکل ہی اجنبی ہوتے ہیں اور صحن میں میری موجودگی کے باوجود دعا سلام کیے بغیر ہی گزر جاتے ہیں؛ اور جو چہرے مہرے

سے میرے شناسا ہوتے ہیں ان میں سے اکثر مجھے پاگل سمجھتے ہیں اور مجھے ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے میں ابھی انھیں کاٹنے کو دوڑوں گا اور جو ایسا نہیں سمجھتے ان کے ساتھ میرا کوئی ایسا گہرا تعلق نہیں کہ فروری کی دھوپ میں جندر کے صحن میں میری عدم موجودگی انھیں کھٹکے اور وہ میرا اتا پتا کرنے جندر کے دروازے تک چلے آئیں۔ ایسا آدمی جو صحن میں میری عدم موجودگی محسوس کر کے جندر کے دروازے تک آئے، ہفتے میں بہ مشکل ایک آدھ ہی یہاں سے گزرتا ہے۔ آخری شخص پانچ دن پہلے جندر کے صحن میں اترا تھا اور وہ بھی میرا اتا پتا کرنے نہیں اپنی کھوئی ہوئی بکری کے بارے میں پوچھنے آیا تھا۔

اس لیے یہ بھی ممکنات میں سے ہے کہ مطلوبہ شخص اگلے بیس بل کہ پچیس دنوں میں بھی یہاں سے نہ گزرے۔ ایسی صورت میں میری لاش یقیناً گل سڑ چکی ہوگی اور کیڑے مکوڑے اور چونٹیاں، جن کا رزق کی تلاش میں آنا جانا ویسے بھی یہاں لگا رہتا تھا، میری ہڈیوں پر موجود ماس، جو گزشتہ پینتالیس دنوں میں، خالی گھومتے جندر کی کوک کی شدت نے، ان کی آسانی کے لیے، میری ہڈیوں سے علاحدہ کر دیا ہے، اپنا رزق بنا چکی ہوں گی۔

میں اگرچہ اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا مگر زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ اس کام کا آغاز میرے چہرے سے کریں گی کہ سردی کی وجہ سے مرتے ہوئے بھی میرا باقی جسم اسی طرح رضائی میں لپٹا ہوگا اور یہ نقاہت؛ جس کا آغاز تو کئی دن پہلے ہی ہو چکا تھا مگر گزشتہ شام سے اس میں کچھ زیادہ ہی تیزی آگئی ہے، مجھے اس قابل نہیں چھوڑے گی کہ آخری وقت میں، میں ٹانگوں یا جسم کے کسی دوسرے حصے پر سے رضائی کھسکا سکوں۔ زیادہ قرین قیاس بات تو یہ ہے کہ وہ مجھے نوچ کر لے جانے کا آغاز میری آنکھوں کے سفید حصے سے کریں گی، جو اس وقت تک مزید سفید ہو چکا ہوگا۔ پہلے مرحلے میں آنے والی چیونٹیوں کی ٹولی، رضائی میں لپٹے میرے دھڑ پر سے سفر کرتی ہوئی جب زرد ہو چکے میرے چہرے تک پہنچے گی تو اسے میری سفید آنکھیں آٹے کے مانند لگیں گی۔ ٹولی میں موجود چیونٹیاں پہلے تو اپنے اپنے چھ پیروں میں سے دو

درمیانے پیروں کو مضبوطی سے جما کر کھڑی ہو جائیں گی پھر اگلے دو پیروں کو حرکت میں لاکر میری آنکھوں کا ماس کھودنے اور پچھلے دو پیروں کے ذریعے اسے ایک طرف ہٹانے کی کوشش کریں گی، لیکن تھوڑی ہی دیر کی محنت مشقت کے بعد انھیں اندازہ ہو جائے گا کہ انھیں کھودنے کی کوششیں بے کار ہیں۔ پھر وہ اپنے پیروں کے بجائے اپنے سر پر لگی ''زندہ قینچی'' کو عمل میں لاکر انھیں کترنا شروع کر دیں گی۔ اسی دوران میں وہ، ایک نامعلوم مواصلاتی رابطے کے ذریعے زیرِ زمین، اپنے تاریک گھروں میں موجود، باقی ساتھیوں کو بھی فوراً آگاہ کر دیں گی اور اطلاع پاتے ہی وہاں موجود بے شمار چیونٹیاں، گھروں کے برآمدوں میں بے حس و حرکت لگی اپنی اپنی ٹوکریوں کی طرف دوڑ پڑیں گی اور اس وقت تک اپنی نوکیلی مونچھوں کے ذریعے، انھیں بار بار چھوتی رہیں گی جب تک وہ زندہ ہو کر حرکت نہ کرنے لگیں۔ جوں ہی ٹوکریاں حرکت کریں گی ان کے جبڑے کھل جائیں گے اور ان کے لبوں سے رس کے قطرے ٹپکنا شروع ہو جائیں گے ہر چیونٹی اپنی اپنی ٹوکری کا رس چاٹتے ہی تازہ دم ہو کر مزدوری کرنے میری طرف چل پڑے گی اور ان کا یہاں آنا جانا اس وقت تک لگا رہے گا جب تک میرے چہرے پر ماس کا ایک بھی ریشہ باقی ہے۔

سانپ، چھپکلیاں، لال بیگ اور دوسرے کیڑے مکوڑے بھی اس سلسلے میں ان کا ہاتھ بٹائیں گے لیکن ان میں سے بیشتر ایسے ہوں گے جنھیں میرے باسی گوشت سے زیادہ ان زندہ چیونٹیوں سے دلچسپی ہو گی۔ ہاں جب کوئی کیڑا مکوڑا کسی اجنبی جنس کے کیڑے مکوڑے کو جا دبوچے گا تو چیونٹیوں کے ہاتھ بھی کچھ تازہ گوشت لگ ہی جائے گا اور وہ میرے جسم کو چھوڑ کر اس کی لاش پر پل پڑیں گی۔ ان میں سے کچھ چیونٹیاں میرے کھلے ہوئے منہ کے رستے پیٹ کی طرف اور کچھ نتھنوں کے ذریعے دماغ کی طرف سفر کریں گی اور میرے دماغ کے پیچیدہ تانے بانے کو جنھیں بابا جمال دین کی سنائی ہوئی لوک داستانوں اور کتابوں میں پڑھی ہوئی کہانیوں نے اور بھی پیچیدہ بنا دیا ہے، یوں ادھیڑ کر رکھ دیں گی جیسے ہاتھوں سے بُنی سویٹر کو ایک دھاگا کھینچ کر آسانی سے ادھیڑ لیا جاتا ہے۔ میری یادداشت کو محفوظ رکھنے والے خلیے تو یقیناً ان کا رزق بن

جائیں گے لیکن میں ان ہزاروں کرداروں کے انجام کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا،جنھوں نے کہانیوں سے نکل کر میری یادداشت میں پناہ لی تھی؛ اور نہ ان خوابوں کے بارے میں جنھیں اس کائنات میں صرف میں نے دیکھا۔

چہرے کو چھوڑ کر جسم کا نچلا حصہ، جو رضائی میں لپٹا ہوگا ،اس کے ان چیونٹیوں اور کیڑے مکوڑوں کا رزق بننے کی نوبت ہی نہیں آئے گی کہ روئی کی گرمائش سے،اس میں آہستہ آہستہ خودبخود کیڑے پیدا ہونا شروع ہو جائیں گے جو اس وقت تک کلبلاتے رہیں گے جب تک انھیں،میرے تن کا گل سڑ چکا ماس، دستیاب رہے گا، جوں ہی یہ ماس ختم ہوگا ان کی زندگی کا بھی اختتام شروع ہو جائے گا اور پھر ان کی گرتی لاشیں بھی باہر سے آئے ہوئے، کیڑوں مکوڑوں اور چیونٹیوں کے کام آئیں گی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ندی کے چھوٹے چھوٹے پرسکون تالابوں میں مچھلیوں اور مینڈکوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے اود بلاؤ بھی پانی سے باہر نکل کر جندر کی طرف چل پڑیں ۔اگر ایسا ہوا تو رضائی میں لپٹے مرے وجود کو یوں ہی بے کار گلنے سڑنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔اود بلاؤ؛ جن کے تیز دانت کا ہو جیسے مضبوط درختوں کی ٹہنیاں کاٹ کر ندی کے بہاؤ کے آگے بند باندھ کر پانی تالابوں کی طرف موڑ دینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، نہ صرف رضائی کو بل کہ میری ہڈیوں سے لپٹے ماس کو بھی بہت قلیل وقت میں چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔ یوں یہاں،اس رضائی کے نیچے،ہڈیوں کا ویسا ہی ڈھانچا رہ جائے گا، جیسا یہاں سے سات میل دور قصبے کے سرکاری اسپتال کے کمروں میں لٹکے انسانی ڈھانچوں کی تصویروں میں ہوتا ہے۔

میرے وجود کو ڈھانچے میں تبدیل ہونے سے صرف اسی صورت روکا جاسکتا ہے کہ وہ ممکنہ آدمی پرسوں تک یہاں سے ضرور گزرے۔ہاں ایک دوسری صورت ،میری موت کے فوراً بعد بجو کی آمد کے امکان سے بھی وابستہ ہے لیکن مجھ جیسا آدمی بھی ،جس نے ساری زندگی داستانوں،لوک کہانیوں،،افسانوں اور ناولوں میں بسر کی اور جو ہمیشہ ان ہونیوں اور مافوق

الفطرت واقعات کوحقیقت کے روپ میں دیکھتا چلا آیا ہے، اس کی صحت کے بارے میں آج بھی تذبذب کا شکار ہے۔

بجو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ کائنات کی واحد مخلوق ہے جسے انسانی ٹخنوں میں دھڑکتی اس رگ کا پتا ہوتا ہے جسے پکڑنے سے مردہ اُٹھ کر چلنا شروع کر دیتا ہے۔ بابا جمال دین کے بقول اگر مردے کو دفنانے کے بعد قبر پر کانٹے دار پھنگیں نہ رکھی جائیں تو آدھی رات کے وقت بجو انسانی لاش کی بو پا کر قبرستان میں داخل ہوتا ہے اور اپنے پنجوں سے قبر کھود کر اس میں اتر تا جاتا ہے اور لاش کو اسی تنگ سوراخ میں سے گھسیٹ کر باہر نکالتا ہے اور پھر پاؤں کی طرف سے کفن پھاڑ کر ٹخنوں میں موجود اس رگ کو پکڑ کر مردے کو اپنے ساتھ چلا کر اپنے بل میں لے جاتا اور اپنی بیوی بچوں کے ساتھ اگلے تین چار دنوں میں اسے چٹ کر جاتا ہے۔

میرے علاقے کے بہت سے لوگ اب بھی اس کہانی کی صحت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو نہیں بھی رکھتے، وہ بھی صدیوں سے چلے آئے رواج کے مطابق اپنے عزیزوں کی قبروں کو اس کی دست برد سے بچانے کے لیے ان پر کانٹے دار درختوں، خاص کر جنڈ ی کی، پھنگیں رکھتے ہیں اور یہ پھنگیں اس وقت تک قبر پر موجود رہتی ہیں جب تک اسے باقاعدہ پکا کرنے کا بندوبست نہیں کر لیا جاتا، یا یہ یقین نہیں کر لیا جاتا کہ اب مردہ مکمل طور پر گل سڑ چکا ہوگا۔ اگر میں بھی اس کہانی کی صداقت پر ایمان رکھنے والوں میں شامل ہوتا تو مجھے اپنی موت کے بعد یہاں آنے والے، اس آدمی کے بارے میں کسی قسم کا کوئی تجسس نہ ہوتا، جس کے بارے میں، میں گزشتہ پینتالیس دنوں سے مسلسل سوچ رہا ہوں۔ ایسی صورت میں، جوں ہی موت میری زندگی پر فتح پاتی، میری تازہ لاش کی مخصوص بو، جسے سونگھنے کی صلاحیت صرف بجوؤں کو حاصل ہے، ندی کے پانیوں پر تیرتی ہوئی، ان کے بلوں میں جا گھستی اور وہاں سے ایک ساتھ اتنے بجو نکل آتے کہ انھیں نہ تو میری قبر کھودنے کا تردد کرنا پڑتا اور نہ ہی مجھے ساتھ لے جانے کے لیے اس رگ کو تلاش کرنا پڑتا، جس کے بغیر وہ عام حالات میں لاش کو ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ اول تو وہ سب مل کر

مجھے یہیں چٹ کر جاتے اور اگر وہ مجھے ساتھ لے جانے کی کوشش کرتے تو بھی سب مل کر آسانی سے گھسیٹ کر لے جاتے۔

لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں ایک پر تخیل آدمی ہونے کے باوجود بھی اس پر یقین نہیں کر پا رہا اور میرا ایمان ہے کہ آدمی جیسا سوچتا ہے، اس کے ساتھ ویسا ہی پیش آتا ہے۔ سوہڈیوں کا خوف ناک ڈھانچہ بننا شاید میرا مقدر بن چکا ہے، یہی وجہ ہے کہ میرے دماغ کی سوئی اب بھی اسی آدمی پر اٹکی ہوئی ہے، جس نے سب سے پہلے مجھے مردہ حالت میں پایا اور گاؤں والوں کو میری موت کی اطلاع بہم پہنچایا ہے۔

## ۲

اگر یہاں آنے والے اس پہلے ممکنہ شخص نے آنے میں واقعی اتنی دیر کر دی تو اسے، اس کی سزا شدید خوف اور دہشت کی صورت میں بھگتنا پڑے گی۔ وہ جوں ہی مجھے ملنے کے ارادے سے سات قدمی زینے پر قدم رکھے گا، میرے گل سڑ چکے ڈھانچے سے اٹھنے والی بدبو کا ہلکا سا بھبکا اس کا استقبال کرے گا۔ یہ بدبو مرے ہوئے چوہے کی بدبو سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوگی۔ جیسے ہی بدبو کا بھبکا اس کے نتھنوں میں داخل ہوگا وہ اردگرد نظریں دوڑائے گا کہ مبادا اس کا پاؤں ان جانے میں کسی چوہے کی لاش پر پڑ جائے۔ اتنے میں وہ آخری زینے پر پاؤں رکھ کر صحن میں داخل ہو چکا ہوگا اور بدبو اتنی تیز ہو چکی ہوگی کہ وہ بے اختیار اپنا کوئی سا بھی ایک ہاتھ اٹھا کر اپنے منہ کے قریب لے جائے گا اور شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے اپنے دونوں نتھنے یوں بند کر دے گا جیسے وہ جندر کے صحن کے بجائے ندی کے گہرے پانی میں اتر رہا ہو اور پانی اس کے منہ اور ناک کو چھونے لگا ہو۔ وہ غوطہ لگانے کے سے انداز میں یوں ہی اپنے ہاتھ سے منہ اور ناک ڈھانپے آگے بڑھے گا اور بائیں مڑ کر جیسے ہی دروازہ کھولے گا، بدبو کا ایک زوردار بھبکا اس کے ڈھانپے ہوئے منہ اور ناک کے باوجود اس کے دماغ میں سرایت کر جائے گا۔ میرے خوف ناک ڈھانچے پر پہلی نظر پڑتے ہی اس کے منہ سے بے اختیار ایک خوف ناک چیخ نکل جائے گی؛ جو اتنی زوردار ہوگی کہ اس کے نتھنوں اور منہ کو ڈھانپا ہوا اس کا ہاتھ سانس کی نالی سے آتی ہوئی ہوا کے زور سے خود بخود ہٹ جائے گا؛ اور جب یہ چیخ جندر کے بالکل سامنے، بہتی ندی کے دوسری جانب

موجود،اونچے ٹیلے سے،جس پرکھڑے ہوکرگاؤں والے عموماً مجھے گاؤں میں ہونے والے کسی واقعے کی اطلاع،ایک بلندآوازے کی صورت دیا کرتے تھے،ٹکرا کر پلٹے گی اوراس کے کانوں میں گونجے گی تو وہ مزید خوف زدہ ہوجائے گا۔اس گونج کی شدت اتنی تیز ہوگی کہ کچھ لمحوں کے لیے تو اس کا دماغ گھومتا رہے گا۔جب وہ تھوڑا سنبھلے گا تو کمرے میں داخل ہونے کے بجائے ،ایک زوردار جھٹکے سے،جیسے میرے ڈھانچے نے اسے دھکا دے دیا ہو،واپس صحن کی طرف پلٹے گا اور صحن میں موجود اس تھلے سے ٹکرائے گا،جس پر میں گرمیوں کی راتوں میں لیٹ کر جندر کے گھومتے پاٹوں کی سریلی گونج اور شفاف آسمان پر جگ مگ جگ مگ کرتے ستاروں سے بہ یک وقت لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔تھلے سے ٹکراتے ہوئے وہ کچھ دیر وہیں کاہو کے گھنے درخت کے تنے کا سہارا لے کر رکا رہے گا،کچھ سوچے گا اور پھر بغیر کسی تاخیر کے،میرے گاؤں کی راہ لے گا، جو سامنے والے چھوٹے ٹیلے کے پیچھے موجود،اونچی پہاڑی کے دوسری طرف واقع ہے۔ندی عبور کرتے ہوئے وہ ان بڑے پتھروں پر پاؤں نہیں دھرے گا جو بہتی ندی کے بیچوں بیچ گزرنے کے لیے بطور خاص رکھے گئے ہیں بل کہ وہ پانی ہی میں چھلانگیں مارتا ہوا سامنے والے ٹیلے کی طرف بھاگے گا اور ایسا کرتے ہوئے اس کے کپڑے مکمل طور پر بھیگ جائیں گے،مگر وہ اس کی پروا کیے بغیر بھاگتا چلا جائے گا اور چڑھائی میں بھی یوں بھاگتا جائے گا جیسے وہ کسی میدان میں بھاگ رہا ہو۔ٹیلے کی چوٹی پر پہنچنے تک ،اس یخ بستہ موسم میں بھی اس کا جسم پسینے میں نہا چکا ہو گا۔جوں ہی وہ اس بڑی چٹان پر پہنچے گا،جس پر کھڑے ہوکر گاؤں والے مجھے متوجہ کرنے کے لیے آواز بلند کیا کرتے تھے،اس کا خوف قدرے کم ہوجائے گا،وہ وہاں کچھ دیر رک کر اطمینان کا سانس لے گا، پیچھے مڑ کر ایک نظر جندر کے کمرے پر ڈالے گا اور ندی کی نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔

۳

اگر میری موت بیس پچیس سال پہلے، یہاں، اسی صورت میں واقع ہوتی تو میری لاش کو اس طرح گلنے سڑنے کا کوئی اندیشہ لاحق نہ ہوتا کہ ان دنوں جندر کے پچھواڑے سے گزرنے والا یہ راستہ، جو اب تقریباً معدوم ہو چکا ہے، خاصا آباد ہوا کرتا تھا اور یہاں سے ہر وقت؛ حتیٰ کہ رات کو بھی لوگ گزرتے رہتے تھے۔

ان دنوں گاؤں اور اس کے پیچھے موجود وسیع و عریض سرکاری جنگل کو قصبے سے ملانے والی سڑک نہیں بنی تھی اور جنگل سے قصبے تک جانے کے لیے یہی واحد راستہ ہوا کرتا تھا۔ یہ راستہ جو اب اتنا تنگ ہو چکا ہے کہ یہاں سے گزرنے والا بہ مشکل اپنے کپڑوں کو جھاڑیوں میں الجھنے سے بچا تا ہے، تب خاصا چوڑا ہوا کرتا تھا۔ سرکاری نقشے میں، یہ اب بھی جنگل سے لے کر قصبے تک پورے گیارہ فٹ ہے، مگر عدم گزران کے سبب، اس کا حقیقی وجود سکڑ کر فٹ بھر ہی رہ گیا ہے۔ یوں تو یہ رستہ صدیوں سے موجود ہے اور ایک روایت کے مطابق یہ کسی دور میں کشمیر کو ٹیکسلا سے ملاتا تھا اور نیپال اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے تعلق رکھنے والے طالب علم، اسی رستے سے گزر کر ٹیکسلا یونیورسٹی میں پڑھنے جایا کرتے تھے لیکن اسے آج سے کوئی صدی بھر پہلے انگریزوں نے سرکاری جنگل میں آمد و رفت کے لیے ہموار کیا تھا اور اس کی چوڑائی گیارہ فٹ مقرر کی تھی۔ انگریز افسر اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر یہیں سے گزر کر جنگل کا معائنہ کرنے جاتے تھے۔ بابا جمال دین بتایا کرتا تھا کہ وہ یہاں سے ہر ہفتے انگریز افسروں کو گزرتے ہوئے دیکھا کرتا تھا جو کبھی

کبھار، ستانے کے لیے یہاں ______ جندر کے پچھواڑے موجود کاہو کے صدیوں پرانے درخت کے نیچے ______ رکا بھی کرتے تھے، ان کے ساتھ کچھ مقامی سپاہی بھی ہوتے تھے جو گھوڑوں کے پیچھے پیچھے پیدل چل رہے ہوتے تھے۔ واپسی پر بعض دفعہ ان کے ساتھ وہ ملزم بھی ہوتے جو سرکاری درخت؛ بغیر پرمٹ کے کاٹتے ہوئے پکڑے جاتے تھے۔ ان ملزموں کے دونوں ہاتھوں میں لوہے کی ہتھ کڑیاں ہوتیں، جن کے دوسرے سرے گھوڑوں کی زین میں بندھے ہوتے تھے، نیکریں پہنے مقامی سپاہی ہاتھوں میں ڈنڈے لیے گھوڑوں کے ساتھ ساتھ انھیں بھی ہانک رہے ہوتے تھے۔ افسروں کے گھوڑوں پر تو انھیں ڈنڈے برسانے کی جرات نہیں ہوتی تھی البتہ جب کبھی کوئی بھگوڑا (ملزم) تھک کر ہانپنے لگتا تو وہ اس پر خوب ڈنڈے برساتے اور اپنے افسروں کی خوش نودی کا سامان کرتے۔ انگریزوں کے یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا، اس فرق کے ساتھ کے اب گھوڑوں پر اکڑ کر بیٹھنے والے افسر بھی ویسی ہی رنگت کے مالک ہوتے تھے، جیسے ہتھکڑیاں ہاتھوں میں ڈالے گھوڑوں کے پیچھے پیچھے گھسیٹے جانے والے ملزم۔ ہاں خاکی رنگ کی نیکریں پہنے سپاہیوں کی جگہ؛ اب ٹخنوں کو چھوتی، خاکی رنگ کی پینٹ اور پورے بازوؤں والی شرٹ میں ملبوس سپاہیوں نے لے لی تھی۔ لیکن یہ سلسلہ کچھ ہی سال چلا۔ میرے ہوش سنبھالنے تک گھوڑوں پر سوار گندمی رنگت کے افسر اور پیادہ سپاہی دونوں غائب ہو چکے تھے البتہ بغیر پرمٹ کے درخت کاٹنے والے بدستور یہاں سے گزرتے رہتے تھے؛ لکڑی لدے خچروں اور اونٹوں کے ساتھ۔ سورج غروب ہونے کے بعد جیسے ہی دھندلکا پھیلتا ان کے قافلے شرق میں واقع قصبے کی طرف سے طلوع ہونا شروع ہو جاتے اور سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے یوں غائب ہو جاتے، جیسے انھیں روشنی نگل گئی ہو۔ بابا جمال دین نے، جو اندھیرے سے خاصا مانوس تھا اور انھیں اماوس کی راتوں میں بھی دیکھ لیا کرتا تھا، مجھے بتایا تھا کہ انھوں نے اپنے خچروں کے نعلوں پر بھی چمڑا چڑھا رکھا ہوتا تھا تاکہ چلتے ہوئے ان کے قدموں کی آہٹ نہ سنائی دے سکے۔ البتہ وہ لوگ جو باقاعدہ سرکاری پرمٹ لے کر درخت کاٹتے تھے، دن کے وقت

بھی یہاں سے گزرتے رہتے تھے تاہم گرمیوں کے دنوں میں یہ بھی عموماً راتوں ہی کو یہاں سے گزرتے تھے۔ یہ تعداد میں بہت کم تھے، تاہم ان کی نشانی یہ تھی کہ ان کے اونٹوں اور خچروں کے گلوں میں گھنٹیوں کے کینٹھے بندھے ہوتے تھے، اور جب ان کا قافلہ یہاں سے دو میل کے فاصلے پر ہوتا، سامنے والے ٹیلے کی چوٹی پر بیٹھے ہوئے شخص کو ان کی ٹن ٹن سنائی دینے لگتی تھی۔

اپنی نوجوانی کے دنوں تک تو میں بھی انھیں یہاں سے گزرتے دیکھتا رہا تھا۔ مجھے اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی ٹن ٹن بہت بھلی لگتی تھی۔ میں ٹن ٹن کی ان آوازوں سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونے کے لیے، جندر کے کھارے میں بڑی چونگ انڈیلتا، جندر کا دروازہ بھیڑتا اور ندی عبور کر کے سامنے والے ٹیلے پر موجود سب سے اونچی چٹان پر جا کھڑا ہوتا اور اپنے کان جنگل کی طرف سے آنے والے رستے پر لگا دیتا تھا، جہاں سے اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی آواز دور سے بھی بآسانی سنائی دیتی تھی۔ جوں ہی اونٹوں کے گلے میں ٹن ٹن کرتی گھنٹیوں کی ہلکی ہلکی آوازیں میرے کانوں کے پردوں کو چھوتیں میں سمجھ جاتا کہ قافلہ جنگل سے نکل کر اس موڑ پر آ پہنچا ہے، جہاں سے جنگل کے بیچوں بیچ بہنے والی چھوٹی ندی، اس بڑی ندی میں آ کر ملتی ہے۔ ٹیلے پر موجود یہ چٹان ایک ایسا مقام تھا جہاں سے جندر کی گونج اور اونٹوں کے گلے میں ٹن ٹن کرتی گھنٹیوں کی مدھم آواز کی پچ ایک جیسی معلوم پڑتی تھی۔ جوں ہی یہ قافلہ اس مقام پر پہنچتا جہاں کسی دور میں اس علاقے کے راجا کا جندر ہوا کرتا تھا، مجھے اپنے جندر کی گونج اور ندی کے بہتے پانی کا شور، ان اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی ٹن ٹن میں دبتا ہوا محسوس ہوتا اور میں بھی اسی تناسب سے اپنے قدم آہستہ آہستہ اترائی کی طرف بڑھانا شروع کر دیتا تاکہ ان دونوں طرح کی آوازوں کے درمیان وہ توازن برقرار رکھ سکوں جو میری سرشاری کو دوآتشہ کر دیتا تھا۔ جب قافلہ جندر سے صرف دو سو قدم کے فاصلے پر ہوتا، میرے قدم ندی کے پانیوں کو چھو رہے ہوتے۔ میں کچھ دیر ندی کے درمیان موجود ایک چٹان پر کھڑے ہو کر جندر کی گونج اور گھنٹیوں کی ٹن ٹن سے لطف اندوز ہوتا؛ پھر جوں ہی یہ قافلہ جندر کے پچھواڑے پہنچتا اور ٹن ٹن کے

تیز شور میں ندی کی گونج کا دم گھٹنا شروع ہوتا ، میں بھاگ کر جندر کے صحن میں داخل ہو جاتا۔ جہاں جندر کی گونج، ٹن ٹن کے شور سے مل کر ایسا سماں تشکیل دیتی کہ میرا دھمال ڈالنے کو جی چاہتا۔ پھر جوں جوں قافلہ آگے قصبے کی طرف بڑھتا ٹن ٹن کی آوازیں بدستور کم ہونا شروع ہو جاتیں یہاں تک کہ اس مقام پر، جہاں مغرب سے مشرق کی طرف بہنے والی، اس ندی کا رخ اچانک شمال کی طرف مڑ جاتا ہے، یہ آوازیں بالکل معدوم ہو جاتیں اور میں جندر کے کھارے میں نئی چونگ انڈیل کر، اس کے صحن میں موجود تھلے پر لیٹ کر سونے کی تیاریاں کرنے لگتا۔

مگر یہ سب بھلے وقتوں کی یادیں ہیں؛ ان دنوں کی جب صرف میرے ہی نہیں اس ندی میں موجود ہر جندر پر چونگوں کا انتارش ہوتا تھا کہ سب کے سب آٹھوں پہر گھومتے رہتے تھے۔ ان دنوں گاؤں والوں میں سے اکثر کی گزر اوقات کا واحد ذریعہ کھیتی باڑی ہوتا تھا اور اگر کسی سال کوئی شخص کسی وجہ سے بوائی نہ کر سکتا تو اسے زمین سے بے وفائی کا طعنہ دیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان دنوں وہ لوگ بھی، جن کا ذریعہء معاش کچھ اور ہوتا، سال میں دو مرتبہ اپنی زمین پر ہل ضرور چلاتے تھے تاکہ زمین سے بے وفائی کے مرتکب نہ ہوں۔ خود میرا باپ بھی، جس کی گاؤں میں زرعی زمین نہ ہونے کے برابر تھی اور اس کے معاش کا تمام تر انحصار اس جندر کے گھومتے پاٹوں پر تھا، سال میں دو دفعہ ضرور زمین بیجتا تھا، حالاں کہ رکھوالی نہ کرنے کی وجہ سے اول تو زمین میں بیجا گیا دانہ پرندے چگ جاتے تھے اور اگر زمین سے کچھ پھوٹ بھی نکلتا تو اسے اڑوس پڑوس کے مال مویشی تباہ کر کے رکھ دیتے تھے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا، اسے ہمیشہ زمین بیجتے ہوئے ہی دیکھا؛ کبھی کٹائی یا گاہی کرتے ہوئے نہیں پایا۔ تاہم اس کے باوجود جب بذریعہ لیتری گاؤں کی فصل مشترکہ طور پر کٹ رہی ہوتی تو وہ اس میں شرکت ضرور کرتا۔ اگر اس کے اپنے کھیتوں میں کسی سال فصل ہو بھی جاتی تو وہ اسے اپنے چھوٹے بھائی کے حوالے کر دیتا۔ وہی کٹائی کرا کر اپنی فصل کے ساتھ اسے گاہ لیتا اور بھوسے سمیت دانے بھی خود رکھ لیتا؛ مگر اگلی بار جب بوائی کا موسم آتا تو میرا باپ بطور خاص اسکول جا کر میری چھٹی منظور کراتا، مجھے چنگوں کی ترتیب

سمجھاتا ـــــــ کہ فلاں چونگ کے بعد فلاں چونگ کھارے میں انڈیلنی ہے ـــــــ اور خود اپنے عزیزوں سے بیل ادھار مانگ کر ہل جوت لیتا۔ وہ جب سامنے والی پہاڑی کی چوٹی پر موجود بڑے کھیت میں، جواب ایک عرصے سے بچوں کے کھیلنے کا میدان بنا ہوا ہے، بیلوں کو ہنکارتا تو اس کی آواز مجھے یہاں جندر کے صحن میں بھی واضح طور پر سنائی دیتی۔

فصلوں؛ خاص کر گندم کی کٹائی اور گاہی کے دنوں میں وہ لوگ بھی جو شہر میں نوکری یا کاروبار کر رہے ہوتے، راتوں رات گاؤں آجاتے اور صبح سویرے درانتیاں اٹھائے لیتریوں میں شمولیت کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔ سب مل جل کر ایک دوسرے کی فصلیں کاٹتے، انھیں ڈھو کر مکانوں کے صحنوں اور کھلیانوں میں جمع کرتے اور پھر بیلوں کی جوڑیوں کے پیچھے کاہو کی خشک پھنگیں باندھ کر اسے گاہتے۔ مکئی کی کٹائی کے بعد گاؤں کی عورتیں مل کر اسے چھیلتیں اور پھر مرد، راتوں کو بھاری سوٹے لے کر اسے کوٹتے اور ان کے دانے علاحدہ کرتے۔ شاید یہی مجبوریاں تھیں جو لوگوں کو ایک دوسرے سے جڑے رہنے اور محبت کرنے پر اکساتیں تھیں۔

ایسے حالات میں، ان دنوں یہاں، میری موت کی صورت میں، جس کا سبب بھی یقیناً مختلف ہوتا، صورتِ حال خاصی مختلف ہوتی۔ صبحِ کاذب کے وقت ہی کوئی نہ کوئی شخص چونگ اٹھائے دروازے سے، جو اس کے دستک دینے کی کوشش میں خود بخود کھل جاتا، اندر آجاتا، آرام سے چونگ اتار کر ایک طرف رکھتا، اندھیرے میں ٹٹول کر لالٹین تلاش کر کے اسے روشن کرتا؛ پھر یہ سوچ کر کہ میں گہری نیند سویا ہوا ہوں، وہ باہر جا کر لکڑیاں اٹھالاتا، آگ جلا کر کچھ دیر ہاتھ تاپتا؛ چولہے کے کنارے رکھا گھڑا اٹھا کر باہر صحن کے ساتھ موجود کیاری میں اس کا پانی انڈیلتا اور سیدھا اس چشمے پر چلا جاتا، جس کا پانی سردیوں کے دنوں میں سویرے سویرے گرم اور گرمیوں کے دنوں میں ٹھنڈا یخ ہوتا ہے۔ بھاپ اٹھتے گرم گرم، تازہ پانی سے، گھڑا بھرتا اور واپس آکر چائے کے لیے دیگچی چولھے پر چڑھا دیتا۔ جب چائے تیار ہو جاتی تو وہ جگانے کے لیے، مجھے آواز دیتا؛ دو تین متواتر آوازوں کے بعد جب میرے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوتی تو وہ ہاتھوں

سے ہلا کر جگانے کے لیے میری طرف لپکتا اور جوں ہی اپنا ہاتھ میرے سرد ہو چکے جسم سے مس کرتا، اس کی گھگھی بندھ جاتی اور وہ بے اختیار میری لاش سے لپٹ کر رونا شروع کر دیتا۔ رو دھو کر جب اس کا غم کچھ ہلکا ہوتا تو اپنے صافے سے آنسو پونچھ کر پہلے میری آنکھیں اور پھر میرا کھلا ہوا منہ بند کرتا۔ کچھ دیر تک میرے چہرے کی طرف دیکھتا رہتا پھر باہر دروازے کی طرف دیکھتا جہاں سے روشنی کی کرنیں اندر آ رہی ہوتیں۔

وہ اٹھ کر باہر صحن میں آ جاتا اور محنت مزدوری کے لیے قصبے کی طرف جانے والے لوگوں کو آوازیں دے کر اپنی طرف متوجہ کرتا، وہ اس کی روہانسی آواز ہی سے اندازہ لگا لیتے کہ کوئی ان ہونی ہو گئی ہے اور وہ سب کے سب، اس ان ہونی کے بارے میں جاننے کے لیے، جندر کے صحن کی طرف دوڑ لگا دیتے۔ ان میں سے کئی میرے شناسا ہوتے جو باری باری میری لاش سے لپٹ کر روتے۔ غم ہلکا کر چکا شخص؛ جندر کے کمرے میں پڑے پانی کے گھڑے اٹھاتا اور وہاں کھڑے کچھ دوسرے لوگوں کو بھی چشمے پر چلنے کا اشارہ کرتا اور وہ اشارہ پاتے ہی اس کے ساتھ ہو لیتے۔ باقی میں سے کچھ صحن کے کونے میں پتھروں کا چولھا بنا کر آگ جلانے کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتے۔ جوں ہی پانی بھر کر لانے والے واپس پہنچتے، پانی کسی برتن میں ڈال کر چولھے پر چڑھا دیتے؛ ان میں سے ایک شخص کاہو کی ٹہنیاں توڑنے درخت پر چڑھ جاتا اور پھر سب مل کر ان ٹہنیوں سے پتے علاحدہ کر کے پانی میں ڈالتے، پانی ابلتے ہی وہ اسے اتارتے اور میرا جنازہ پاک کرنے لگ جاتے۔ اسی اثنا میں، ان میں سے ایک دو لوگ میرے گاؤں پہنچ کر میرے عزیزوں کو میری موت کی خبر دے چکے ہوتے اور جب وہ پہنچتے تو میرے جنازے کو غسل دیا جا چکا ہوتا۔

۴

ندی جوڑیاں میں واقع میرے اس جندر کی پونے دو سو سالہ زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ یہ پینتالیس دن تک ایک دانہ بھی پیسے بغیر مسلسل گھومتا رہا ہے اور اس کی درد اور یاسیت بھری کوک نے نہ صرف مجھے، بل کہ اس کے در و دیوار کو بھی نڈھال سا کر دیا اور ابھی تو اسے اس وقت تک اسی طرح گھومتے رہنا ہے جب تک اس پہلے شخص کی یہاں آمد نہیں ہو جاتی، جس نے گاؤں والوں کو میری موت کے بارے میں مطلع کرنا ہے۔

میری کہانی کی طرح اس جندر کی کہانی بھی بہت عجیب ہے۔ اسے میرے دادا کے دادا احمد خان نے اپنے چھوٹے بھائی محمد خان کے ساتھ مل کر صرف ایک مہینے کے مختصر عرصے میں تعمیر کیا تھا حالاں کہ اتنا عرصہ صرف پانی کے کٹھے کی کھدائی اور ندی پر بند باندھ کر پانی موڑنے کے لیے بھی ناکافی تھا۔ اس پر مستزاد، اس کی دیواروں کی چنائی میں استعمال ہونے والے یہ دیو قامت پتھر، جن میں سے ہر ایک کو دھکیلنے کے لیے کم از کم درجن بھر آدمی درکار ہیں، انھوں نے تن تنہا نہ صرف انھیں دھکیلا بل کہ اٹھا کر ایک دوسرے کے اوپر بھی رکھا۔ کیا آپ بارہ فٹ لمبے اور آٹھ فٹ چوڑے کسی ایسے کمرے کا اندازہ کر سکتے ہیں جس کی اگلی دیوار کو چھوڑ کر باقی تینوں دیواریں صرف دو درجن کے قریب پتھروں سے بنی ہوئی ہوں یعنی ہر دیوار صرف آٹھ بڑے پتھروں پر مشتمل ہو۔ یہ جو درمیان میں چند چھوٹے موٹے پتھر نظر آتے ہیں، یہ صرف ان بڑے پتھروں کی سطح ہموار کرنے اور ان کی درزوں کو بھرنے کے لیے رکھے گئے ہیں، ان کی چنائی سے

دیواروں کی اونچائی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ان پتھروں کی مخصوص گولائی اور شکل وصورت سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انھیں ندی سے نکال کر اس کنارے تک لایا گیا تھا۔گویا اب جو پانی ان کے نیچے سے گزر رہا ہے، پہلے؛صدیوں تک ان کے اوپر سے گزرتا رہا ہوگا۔گو انھیں پانی سے نکلے اور یہاں دیواروں میں نصب ہوئے پونے دوسو سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن یہ اب بھی اسی طرح پھسلواں ہیں جیسے پانی سے نکلتے وقت تھے اور یہ پھسلاہٹ انھیں چھو کر اب بھی بخوبی محسوس کی جاسکتی ہے۔بہتا پانی اپنے رستے میں آنے والے پتھروں پر موجود کھردراہٹ کو ختم کر کے ان کے وجود میں ایک ایسی پھسلاہٹ بھر دیتا ہے جو مچھلی کے بدن کا خاصہ ہے۔اگر آپ آنکھ بند کر کے، اپنا ہاتھ ایسے کسی پتھر پر پھیریں، جو ایک طویل عرصے تک بہتے پانی کی زد میں رہا ہو،تو آپ کو یوں محسوس ہوگا جیسے آپ کسی مچھلی کے بدن پر ہاتھ پھیر رہے ہیں۔اسی پھسلاہٹ نے میرے دادا کے داداؤں کا کام آسان بنایا ہوگا اور انھیں،ان بھاری پتھروں کو،ندی کے بہتے پانی سے نکال کر یہاں لانے میں آسانی رہی ہوگی۔البتہ انھیں ایک دوسرے کے اوپر رکھنا ایک ایسا مرحلہ ہے کہ جس کے بارے میں سوچتے ہوئے آدمی حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔لیکن اس جندر کی نیو پڑنے کے پیچھے جو کہانی ہے وہ اس سے بھی زیادہ حیران کن ہے۔

یہ کہانی اتنی مشہور ہے کہ اب اسے پورے علاقے میں ایک لوک داستان کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔اگرچہ مختلف لوگوں کے ہاں اس کی جزیات میں تھوڑا بہت فرق ہے،ویسا ہی فرق جیسا لوک داستانوں میں عموماً ہوتا ہے۔ممکن ہے اس میں تھوڑا بہت مبالغہ بھی شامل ہو لیکن اپنی روح میں یہ بالکل حقیقی ہے؛اتنی ہی حقیقی جتنا موت کا سامنا کرتا میرا یہ وجود۔میں نے اگرچہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ،اسے بہت سے لوگوں سے سنا؛لیکن بابا جمال دین سے، جو رشتے میں میرا دادا لگتا تھا، میں نے یہ کہانی اتنی مرتبہ سنی کہ اس کی زبانی سنی ہوئی پوری کی پوری کہانی، اپنی تمام تر جزیات کے ساتھ،میری معدوم ہوتی یادداشت میں اب بھی محفوظ ہے اور میری موت کے بعد بھی جب تک میرا دماغ زندہ ہے ــــــــ کہ میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ مرنے

کے بعد بھی آدمی کا دماغ کچھ دیر کے لیے زندہ رہتا ہے ______ محفوظ رہے گی۔ بابا جمال دین، جس نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ اسی جندر پر گزارا، ایک جذب کے سے عالم میں یہ کہانی یوں سناتا تھا جیسے یہ سب اس کا آنکھوں دیکھا ہو، حالاں کہ وہ اس کے دو کرداروں میں سے ایک کا پوتا تھا اور جب یہ واقعہ پیش آیا تھا اس وقت یہ دونوں کردار کنوارے تھے۔ بابا جمال دین کے بقول:

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہمارے خاندانی جندر سے پورے ایک میل کے فاصلے پر، ندی کے بہاؤ کی الٹی جانب، ایک ہی جندر ہوتا تھا، جو علاقے کے راجا کی ملکیت تھا۔ یہ راجا تھا تو مسلمان لیکن اسے مقامی سکھ حکومت کی پوری پشت پناہی حاصل تھی اور انھوں نے اسی کے ذریعے اس دور دراز علاقے پر اپنا مکمل تسلط جما رکھا تھا۔

جندر کے پاٹ ان دنوں بھی دوتارو کے اسی مقام پر تراشے جاتے تھے، جہاں یہ ندی اپنا وجود کوہِ رمیال کے دوسری طرف بہنے والی ندی نیلاں میں گم کرتی ہے۔ چوں کہ ان دنوں چھکڑے وغیرہ نہیں ہوتے تھے اس لیے ان پاٹوں کو وہاں سے لانے کے لیے آدمیوں کی ایک پوری ٹولی جاتی تھی۔ جوان پہیہ نما پاٹوں کے وسط میں موجود سوراخوں میں کاہو کا مضبوط بالا ڈال کر، انھیں ہموار زمین پر پہیے کی طرح چلا کر لایا کرتے تھے اور جہاں کہیں زمین کی سطح ناہموار ہوتی، انھیں کندھوں پر اٹھا کر چل دیتے تھے۔ فاصلہ جتنا زیادہ ہوتا اتنے ہی زیادہ آدمی اس کام کے لیے ساتھ لے کر جانا پڑتے تھے کہ جب ایک ٹولی تھک جائے تو دوسری اس کی جگہ لے لے اور تھکن اتارنے میں وقت ضائع نہ ہو۔

۱۸۴۱ء میں ہونے والی شدید بارشوں کے باعث، ہزارہ میں بہنے والی دوسری ندیوں کی طرح اس ندی میں بھی شدید سیلاب آیا تھا، جس کے باعث پانی نے جندر کو اس کے بھاری پاٹوں سمیت نہ صرف بنیادوں سے اکھاڑ پھینکا تھا بل کہ اس کا سارا ملبہ بھی اپنے ساتھ بہا کر لے گیا تھا۔ پانی اترنے کے بعد جندر کو از سرِ نو تعمیر کیا گیا اور اس کے لیے دوتارو کے مقام پر نئے پاٹ ترشوائے گئے۔ کمرے کی تعمیر اور دیگر ضروری کل پرزوں کی تنصیب کے بعد جب ان پاٹوں

کو اٹھا کر لانے کا مرحلہ آیا تو ایک صبح دو درجن کے قریب لوگوں کو پاٹوں کی جوڑی لانے دو تارو روانہ کیا گیا، جن میں میرا دادا محمد خان اور اس کا بڑا بھائی احمد خان بھی شامل تھا۔ میرے داداؤں کو چھوڑ کر باقی تمام لوگ راجا کی اپنی ذات برادری کے تھے۔

شام ڈھلے جب یہ قافلہ جندر کے پاٹوں کی جوڑی لے کر واپس پہنچا تو ان کی خوب آؤ بھگت کی گئی۔ ان کے لیے دیسی گھی میں طرح طرح کے کھانے پکائے گئے اور خصوصی مٹھائی بھی تیار کی گئی۔ جب کھانے کی میز پر بیٹھنے کی باری آئی تو انھوں نے ان دونوں بھائیوں کو کھانے کے بڑے کمرے میں بٹھانے کے بجائے باہر برآمدے میں بٹھایا؛ اور خصوصی طور پر پکائے گئے کھانے کے بجائے انھیں لسی میں پکا ہوا سرسوں کا ساگ اور مکئی کی چند روٹیاں دی گئیں۔ انھوں نے خاموشی سے کھانا کھایا اور وہاں سے نکل آئے۔

اگلے دن جب راجا کے آدمی پاٹوں کی تنصیب کے لیے، مستریوں کو ساتھ لے کر، جندر پر پہنچے تو جوڑی میں سے ایک پاٹ غائب تھا۔ وہ کافی دیر اسے ادھر ادھر جھاڑیوں میں تلاش کرتے رہے کہ مبادا کسی نے انھیں کہیں لڑھکا دیا ہو لیکن تلاش بسیار کے باوجود جب اس کا کہیں نام ونشان نہ ملا تو انھوں نے اس کی اطلاع فوراً راجا کو دی۔ راجا یہ نئی کہانی سن کر بہت پریشان ہوا کیوں کہ علاقے کے راجا کی کسی چیز کی، اور، وہ بھی اتنی اہم اور قیمتی چیز کی، چوری کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے کسی شخص کو اس کی شملات میں سے بغیر پوچھے کلھاڑی کے لیے کاہو کا ایک دستہ کاٹنے کی بھی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

اس واقعے کی خبر، جنگل کی آگ کی طرح، فوراً علاقے بھر میں پھیل گئی اور شام تک علاقے کے تمام لوگ اس کے گھر، اس چوری کا افسوس کرنے پہنچ گئے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے، جن کے دل میں اس واقعے کے رونما ہونے سے لڈو پھوٹ رہے تھے لیکن اس خیال سے کہ افسوس کے لیے نہ جانے کی صورت میں کہیں اس چوری کا الزام انھی کے سر نہ منڈھ دیا جائے، اپنے تمام ضروری کام چھوڑ کر راجا کی حویلی پہنچ گئے۔ راجا نے اپنے بندے ادھر ادھر بھجوائے،

خاص کر ان لوگوں کے گھروں میں جن پر اسے شک تھا یا جن کے بارے میں اسے اطلاع تھی کہ وہ اردگرد کے دیہات میں چھوٹی موٹی چوریاں چکاریاں کرتے رہتے ہیں۔لیکن پاٹ کی برآمدگی کہیں سے بھی نہ ہو سکی۔وہ اگلے دو روز پوری پوری رات نہ سو سکا۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنا خطرناک کام کون کر سکتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز اس کا ایک رشتہ دار، جو پاٹ لے کر آنے والی ٹولی کی آؤ بھگت میں پیش پیش تھا، اسے، افسوس کے لیے بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے اٹھا کر، پرے لے گیا اور اس یقین کا اظہار کیا کہ یہ چوری انھی دو آدمیوں نے کی ہو گی، جنھیں پاٹ لانے کے لیے دوتارو کے مقام پر ساتھ لے جایا گیا تھا لیکن راجا نے اس امکان کو فوراً رد کر دیا، کیوں کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ لوگ، جو اس کے سامنے سر بھی نہیں اٹھا سکتے، اتنا بڑا اقدام اٹھانے کی جرات کر سکتے ہیں۔ جب راجا کے رشتہ دار نے، بار بار اصرار کیا اور اسے ان کے بارے میں وہ کہانی بھی سنائی؛ جو دبے لفظوں میں گردش کرتی رہی تھی کہ ان کا تعلق اس قبیلے سے ہے جنھوں نے دس سال پہلے بالاکوٹ میں ہونے والی جنگ میں سید احمد بریلوی کا ساتھ دیا تھا اور یہ کہ وہ دونوں خود بھی اس جنگ میں سکھوں کے خلاف صف آرا ہوئے تھے اور جب فتح سکھ افواج کا مقدر بنی اور انھوں نے اس قبیلے کے تمام موضعات کو نذرِ آتش کر دیا تو ان دونوں نے فرار ہو کر اس علاقے میں پناہ لی اور گزشتہ آٹھ دس سالوں سے اسی علاقے میں آباد ہیں، تو وہ انھیں بلا کر پوچھ گچھ کرنے پر راضی ہو گیا۔انھیں بلانے کے لیے فوراً ایک بندہ روانہ کیا گیا جو اگلے دو گھنٹوں میں، انھیں لے کر حویلی میں حاضر ہو گیا۔اپنے عزیز کی سنائی ہوئی کہانی کے باوجود چوں کہ راجا کو یقین تھا کہ پاٹ کو غائب کرنے میں ان دونوں کا ہاتھ نہیں، اس لیے اس نے، الگ کمرے میں لے جا کر، ان سے تفتیش کرنے کے بجائے، وہاں موجود لوگوں کے سامنے ہی ان سے پوچھ گچھ کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ جب وہ کانپتی ہوئی آواز اور خوف سے لرزتے ہوئے جسموں کے ساتھ اس الزام کی تردید کریں تو باقی لوگوں پر بھی رعب پڑے اور وہ بھی عبرت پکڑیں لیکن جو کچھ اس کے ساتھ پیش آنے

والا تھا وہ اس سے بالکل بے خبر تھا۔

جب وہ دونوں اس کے سامنے پیش کیے گئے تو وہ قیافہ شناس ہونے کے باوجود ان کے چہرے پر وہ تبدیلی محسوس نہیں کر سکا جو تین دن پہلے ہی آ چکی تھی ۔جب اس نے انھیں اعتماد کے ساتھ اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا تو اس کا یقین اور بھی پختہ ہو گیا کہ پاٹ غائب کرنے میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں کہ علاقے کا راجا ہونے کے ناتے وہ اس سے پہلے چوری چکاری اور اس نوعیت کے کئی مقدمے نمٹا چکا تھا اور وہ جانتا تھا کہ چور چاہے کتنا ہی بہادر کیوں نہ ہو مقدمے کا سامنا کرتے ہوئے ،اپنا اعتماد کھو بیٹھتا ہے اور قدرتی طور پر اس کے قدموں میں ایک لرزش سی آ جاتی ہے؛اور جیسا کہ اسے بتایا گیا تھا ان دونوں کا تعلق تو تھا ہی ایک ایسے قبیلے سے ،جس کے افراد بالاکوٹ میں ہونے والی جنگ کے بعد مارے مارے پھر رہے تھے اور اس خوف سے کہ کہیں پکڑے نہ جائیں منہ چھپاتے پھر رہے تھے ۔اب وہ جہاں جہاں آباد تھے وہاں کی اکثریت سے دب کر رہتے تھے اور اسے ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

وہ دونوں بھائی اگر چہ کسرتی بدن کے مالک تھے اور ان کی عمریں تیس سے پینتیس سال کے درمیان تھیں لیکن اپنے چہرے مہرے سے ،وہ اپنی عمر سے کم از کم دس بارہ بارہ سال بڑے نظر آتے تھے ۔ان کا لباس پھٹا پرانا اور میلا تھا اور انھوں نے سر پر بزرگوں کی طرح میلی کچیلی پگڑیاں باندھی ہوئی تھیں ۔اپنی عمر سے بڑے لگنے میں ان کی ،ان پگڑیوں کا بھی ہاتھ تھا۔

راجا نے ایک نظر دونوں کے چہرے پر ڈالی ،جہاں سکون اور اطمینان کی جھلک واضح طور پر جھلک رہی تھی چناں چہ اس نے ان پر چوری کا براہ راست الزام لگانے کے بجائے گواہ کے طور پر ان سے پوچھ گچھ کرنے کا ارادہ کیا۔

''جو پاٹ کل تم لوگ ہمارے لوگوں کے ساتھ مل کر دوتارو کے مقام سے لائے تھے ان میں سے ایک ،اگلی ہی صبح وہاں سے غائب تھا ۔تم لوگوں نے اسے کسی کو لے جاتے ہوئے تو نہیں دیکھا؟''

''اسے ہم دونوں اسی رات واپس دوتا رو چھوڑ آئے تھے۔'' دونوں نے ایک ساتھ، بلند آواز میں اعتماد کے ساتھ کہا۔ ان کے ایسا کہنے کی دیر تھی کہ مجمعے میں سے قہقہے بلند ہونا شروع ہو گئے۔ خود راجا جو اپنا رعب برقرار رکھنے کے لیے سنجیدہ ہونے کی کوشش کر رہا تھا زور زور سے ہنسنے لگا۔ کافی دیر تک ان کے قہقہوں سے حویلی کے در و دیوار گونجتے رہے۔

''اور کون کون ساتھ تھا؟'' تھوڑی دیر بعد جب ماحول سنجیدہ ہوا تو راجا کے ایک عزیز نے ان سے پوچھا۔

''کوئی بھی نہیں۔ بس ہم دونوں ہی تھے۔'' دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔ جس پر ایک مرتبہ پھر قہقہے بلند ہوئے۔ کسی کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔

''اچھا یہ بتاؤ تم نے یہ کام کیوں کیا؟'' راجا نے از راہِ مذاق ان سے پوچھا۔

''اس ہتک کی وجہ سے، جو اس دن آپ نے ہمیں دوسروں سے علاحدہ بٹھا کر اور ہمیں روکھی سوکھی دے کر کی تھی۔ ہمیں اسی بات کا غصہ تھا۔ ہم نے آپ کا دیا ہوا کھانا بہ مشکل حلق سے اتارا اور گھر کی راہ لی۔ جب ہم گھر پہنچے تو ہمارے بدن غصے سے کانپ رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب ہم اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹے تو ہمارے بدنوں کی تھرتھراہٹ سے چارپائیاں بھی کانپنے لگی تھیں۔ ہم آدھ گھنٹے تک چارپائیوں پر لیٹے تھرتھراتے جسموں کے ساتھ چھت کو گھورتے رہے۔ ہمیں لگا جیسے چھت بھی ہمارے ساتھ روا رکھے جانے والے ہتک آمیز رویے سے تھرتھرا رہی ہے اور اگر ہم نے اپنا غصہ کسی طرح نہ اتارا تو یہ ہمارے اوپر گر پڑے گی۔ اچانک ہم دونوں خوف زدہ ہو کر ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ بیٹھے۔ میرے ذہن میں فوراً خیال آیا کہ اس غصے کا ایک ہی حل ہے کہ ہم ان میں سے ایک پاٹ ابھی اور اسی وقت واپس وہیں چھوڑ آئیں جہاں سے ہم دوسرے لوگوں کے ساتھ اسے اٹھا کر یہاں لائے تھے۔ میں اپنے اس خیال کا اظہار محمد خان سے کرنے ہی والا تھا کہ اس نے یہی تجویز میرے آگے رکھ دی۔ ہم اسی وقت اٹھے اور تھرتھراتے جسموں کے ساتھ جندر پر پہنچے؛ اور پاٹوں کے پاس ہی پڑے، کاہو کے دو بالوں میں سے ایک، جو ہمیں زیادہ

مضبوط دکھائی دیا، اٹھایا؛ اسے پاٹ کے سوراخ کے آر پار کیا؛ اور اسے کندھوں پر اٹھا کر چل پڑے۔ تقریباً ہر میل کے بعد ہم پاٹ اتار کر زمین پر رکھتے، کچھ دیر آرام کرتے اور پھر اٹھا کر چل پڑتے؛ صبح جب پو پھٹ رہی تھی ہم دوتارو پہنچ چکے تھے۔'' بڑے بھائی نے، پر اعتماد لہجے میں، پوری کہانی سنائی تو راجا لہو کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

راجا کو غصہ پاٹ واپس لے جانے کے حوالے سے سنائی جانے والی اس کہانی پر نہیں تھا کیوں کہ اُس سمیت سب کو یہ کہانی جھوٹی لگی تھی۔ اسے غصہ ان کے گردن اکڑا کر بات کرنے پر تھا۔ اس سے پہلے تو اس کی اپنی برادری میں سے بھی کسی کو یہ جرات نہیں ہو سکی تھی کہ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے اور وہ دونوں تو تھے ہی اس علاقے میں اجنبی، جن کے نام ایک بالشت بھی زمین نہیں تھی۔ اسے اپنا رعب اور دبدبہ، جس کی بدولت وہ علاقے پر راج کرتا تھا، خطرے میں پڑتا ہوا محسوس ہوا۔ لیکن چوں کہ حویلی میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ ان دونوں کو پاگل سمجھ رہے تھے اس لیے ان پاگلوں پر اس طرح ہاتھ اٹھانے میں، اسے اپنی ہتک محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک اس کے ذہن میں انھیں سزا دینے کی ایک ترکیب سوجھی، جس نے آگے چل کر اس جندر کی بنیاد رکھنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

وہ اچانک اپنی کرسی سے اٹھا، ان دونوں سمیت، وہاں بیٹھے تمام لوگوں کو ساتھ لیا اور جندر کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ایک نظر، جندر کے صحن میں پڑے ہوئے بھاری پاٹ پر ڈالی اور اعلان کیا کہ ان دونوں کو یہ پاٹ اٹھا کر پورے ایک میل تک چلنا ہوگا؛ اور اگر وہ ایسا کرنے میں ناکام رہے تو انھیں، میرے چار خوں خوار کتوں کا مقابلہ ایک بند کمرے میں کرنا پڑے گا۔

''اور اگر ہم لے گئے تو۔۔۔'' احمد خان فوراً بول اٹھا۔ اس کے لہجے میں جوش تھا۔

''تو پھر یہ پاٹ بھی تمھارا اور وہ بھی جسے تم لوگوں نے یہیں کہیں چھپا رکھا ہے۔'' راجا نے پرغرور لہجے میں کہا۔

''لیکن ایک شرط اور بھی ہے۔'' اب کے محمد خان گویا ہوا۔

''وہ کیا؟'' راجا کے چہرے پر حیرت تھی۔

''اگر ہم تمھارے مقرر کردہ سنگِ میل تک اسے اٹھا کر لے گئے تو تم ہمیں وہاں جندر بنانے کی اجازت بھی دو گے۔'' محمد خان نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ مجھے تمھاری یہ شرط بھی منظور ہے۔ لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔ تم اسے راستے میں کہیں اتارو گے نہیں۔'' اب کے راجا کے لہجے میں پہلے سے زیادہ کرختگی تھی۔

''ہمیں منظور ہے۔'' دونوں نے ایک ساتھ پراعتماد لہجے میں کہا۔

وہاں موجود تمام لوگ انھیں پاگل سمجھ رہے تھے۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ جندر کا پاٹ جسے چار پانچ آدمی بہ مشکل اٹھا کر ایک فرلانگ تک لے جا سکتے ہیں، یہ دو پاگل اٹھا کر پورے میل کا فاصلہ طے کر پائیں گے۔ ان میں سے بعض تو ایسے بھی تھے جو تصور ہی تصور میں راجا کے خوں خوار کتوں کو ان کی ہڈی بوٹی ایک کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور ایسا سوچتے ہوئے ان کے وجود خوف سے لرز رہے تھے۔

راجا نے اپنے منشی کو، جو اس کی زمینوں کا حساب کتاب رکھتا تھا، حکم دیا کہ جریب منگواؤ۔ منشی نے فوراً ایک بندہ حویلی روانہ کیا جو کچھ ہی دیر میں جریب لے کر حاضر ہو گیا۔ راجا اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور اس کے بندے جریب کے ذریعے، جندر سے مشرق کی طرف ندی کے ساتھ ساتھ چلنے والا راستہ، جو ان دنوں ہموار نہیں تھا اور جسے بہت بعد میں انگریزوں نے اس کے بیٹے کی نگرانی میں ہموار کرایا تھا، ماپنے لگے۔ یوں اس جندر کے پچھواڑے واقع کاہو کا بوڑھا درخت جس پر بہت عرصے تک لوگ منتیں مانگنے آتے رہے ہیں اور اب بھی اس کی شاخوں سے بندھے بے شمار جھنڈے لہرا رہے ہیں، سنگِ میل قرار پایا۔

جب وہ یہاں سے پلٹے تو سورج غروب ہو رہا تھا ان کے واپس حویلی پہنچنے تک دھندلکا پھیل چکا تھا چناں چہ طے پایا کہ کل صبح سویرے یہ دونوں بھائی راجا کے جندر پر پہنچ جائیں گے۔

اور طے کی گئی شرائط کے مطابق اپنی طاقت کا مظاہرہ کریں گے۔

دونوں بھائی واپسی پر گھر آنے کے بجائے سیدھے مائی خیراں کے گھر گئے، جس کی گایوں کا دیسی گھی پورے علاقے میں مشہور تھا، اور اس سے ایک سیر دیسی گھی اور دو بانگی مرغے ادھار لیے اور گھر آ کر بغیر کچھ کھائے پیے سو گئے۔ ادھر راجا نے اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ چاروں کتوں کو اس وقت تک بھوکا رکھا جائے جب تک کل ان دونوں بھائیوں کی قسمت کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔

صبح جب مائی خیراں کے گھر سے لائے ہوئے دیسی مرغوں نے بانگیں دینا شروع کیں تو دونوں بھائیوں نے اٹھ کر مرغ ذبح کیے؛ انھیں دیسی گھی میں اچھی طرح سے تلا اور اپنا اپنا مرغا چٹ کر کے گھی کو مٹی کے کوزے میں ڈال کر باری باری گھونٹ بھرنے لگے۔ نیم گرم گھی پی کر انھوں نے اپنی بھاری پگڑیاں سر پر لپیٹیں اور راجا کے جندر کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو راجا اور اس کے آدمیوں کے علاوہ درجنوں دوسرے لوگ بھی تماشا دیکھنے موقع پر پہنچ چکے تھے۔ تمام مجمع کی نظریں ان دونوں کے چہرے پر تھیں، جن پر سردی کے باوجود پسینے کے قطرے اُمڈ رہے تھے لیکن ان کی سانسیں ہموار تھیں۔

''مارے گئے بے چارے۔''

مجمعے میں سے کسی نے انھیں دیکھتے ہی فقرہ کسا؛ لیکن انھوں نے نہ تو کسی کے چہرے کی طرف دیکھا؛ نہ کسی سے دعا سلام کی اور نہ ہی کسی کے حکم کا انتظار کیا۔ وہاں پہنچتے ہی بڑے بھائی نے زمین پر پڑے ہوئے وزنی پاٹ کو ایک طرف سے اٹھا کر اسے گاڑی کے پہیے کی طرح کھڑا کیا، جب کہ چھوٹے بھائی نے قریب پڑے ہوئے کاہو کے اسی مضبوط بالے کو، جس کی مدد سے وہ گزشتہ روز دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر اسے دوتارو کے مقام سے اُٹھا کر لائے تھے، پاٹ کے وسط میں موجود سوراخ کے آر پار کیا۔ دونوں نے اپنی پگڑیاں اتار کران کے بل نکالے، انھیں ایک منڈاسے کی صورت اپنے اپنے دائیں کندھوں پر رکھا اور دونوں کاہو کے بالے کے نیچے بیٹھ

گئے۔ بیٹھتے ہوئے احمد خان کا منہ بالے کے سرے کی طرف اوراس کی پیٹھ پاٹ کی طرف تھی جب کہ محمد خان کی پیٹھ بالے کے دوسرے سرے کی طرف اوراس کا سینہ پاٹ کی طرف تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیااوراپنے اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے بغیر یوں اٹھ کھڑے ہوئے؛ جیسے بالے کے ساتھ پتھر کا وزنی پاٹ نہیں، بھوسے کی گھڑی بندھی ہوئی ہو۔ جوں ہی وہ اٹھے وہاں کھڑے لوگوں میں سے کئی ایک کے منہ سے حیرت کے مارے چیخیں نکل گئیں اوران میں سے بیشتر کو یقین ہوگیا کہ ان کے اندر کوئی غیر مرئی طاقت ہےاور وہ سب کے سب خوف زدہ ہوکر پرے ہٹ گئے۔ جتنی دیر میں مجمعے نے خود کو سنبھالا وہ ان سے بیس پچیس قدم دور جا چکے تھے۔ راجا بھی یہ منظر دیکھ کر خوف زدہ ہوگیا تھا لیکن اس نے اپنا خوف دوسروں پر ظاہر نہیں ہونے دیا اور چپکے سے گھوڑے پر سوار ہوکر دوسرے لوگوں کے ساتھ ان دونوں کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

اسے یقین تھا کہ ضد اور ہٹ دھرمی سے بدن میں آئی ہوئی طاقت زیادہ دیر ساتھ نہیں دیتی؛ سو ڈیڑھ سو قدم چلنے کے بعد وہ ہانپنے لگیں گےاور اسے اتار پھینکے بغیر، ان کے پاس کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ لیکن جوں جوں ان کے قدم آگے بڑھ رہے تھے، راجا کے یقین میں دراڑیں پڑنا شروع ہوگئیں۔ لیکن اس کی یہ امید بہر حال قائم رہی کہ رستے میں اتار کر دم لیے بغیر، اسے ایک میل تک لے جانا کسی صورت بھی ممکن نہیں۔

تقریباً نصف میل کا سفر طے کرنے کے بعد؛ ایک تنگ موڑ پر آکر جب دونوں بھائی کچھ دیر کے لیے رکے تو راجا کو لگا جیسے اس کی جیت کے امکان پیدا ہوگئے ہیں وہ اب اسے اتار کر اور دم لیے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ پائیں گےاور وہ خیالوں ہی خیالوں میں اپنے خوں خوار کتوں کو، جنھیں رات سے بھوکا رکھا گیا تھا، ان کے جسموں کو بھنبھوڑتے دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوا لیکن اس کی یہ خوشی نقش بر آب ثابت ہوئی۔ دونوں نے ایک مرتبہ پھر اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے ہوئے کاہو کے بالے کو اپنے کندھوں سے اوپر اٹھایا اور سروں کے اوپر سے گھما کر اپنے

اپنے بائیں کندھوں پر رکھ لیا اور دوبارہ پہلے کی سی تیزی سے قدم اٹھانے لگے۔ سردی کے باوجود ان کے بدن اگرچہ پسینے سے تر تھے لیکن ان کے جثّے ذرا بھی نہیں ہانپے تھے اور وہ اب بھی اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے کہ ان کے پیچھے چلنے والے بہ مشکل ان کے قدموں سے قدم ملا پا رہے تھے۔

جب وہ اپنی منزل سے صرف دو سو گز کے فاصلے پر تھے انھوں نے ایک مرتبہ پھر اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے ہوئے وہی عمل دہرایا اور کاہو کے بالے کو اپنے اپنے سروں پر سے گھما کر دوبارہ اپنے دائیں کندھوں پر رکھ لیا۔ اب کی مرتبہ ایسا کرتے ہوئے ان دونوں کے ہاتھ لمحہ بھر کے لیے کانپے ضرور مگر انھوں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

اب تقریباً تمام لوگوں کو یقین ہو چلا تھا کہ وہ شرط جیت چکے ہیں تاہم راجا، جس کے چہرے پر شکست کے خوف کی پرچھائیاں واضح تھیں، اپنے آپ کو تسلی دے رہا تھا کہ دو سو گز کا فاصلہ بھی کچھ کم نہیں ہوتا، اور وہ بھی اس وقت جب آدمی کا جسم تھکاوٹ سے چور ہو چکا ہو۔ اس کی یہ امید اس وقت تک قائم رہی جب وہ اپنی منزل سے دس قدم کے فاصلے پر تھے۔ جوں ہی یہ فاصلہ دس قدموں سے گھٹنے لگا شکست خوردہ راجا کو لگا جیسے اس کے دل کو کچھ ہو رہا ہے، اس کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھانے لگا اور وہ اگلے ہی لمحے، اپنے گھوڑے پر ڈھیر ہو گیا۔ اگر اس کے ملازم پھرتی نہ دکھاتے تو وہ گھوڑے سے گر کر زخمی ہو چکا ہوتا۔ بعد میں اسے چارپائی پر ڈال کر واپس حویلی پہنچایا گیا۔ اگلے ہی روز دونوں بھائیوں کو بلا کر جندر کا پاٹ اور یہ جگہ بطور انعام دے دی گئی اور اسی روز انھوں نے اس جندر کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ میرا یہاں اس طرح مرنا اسی وقت طے ہو گیا تھا جب راجا انھیں یہ جگہ بطور انعام پیش کرنے کا اعلان کر رہا تھا۔ شاید قدرت نے ان دونوں بھائیوں کو یہ موقع فراہم ہی اسی لیے کیا تھا کہ ان کے اس معرکے کے سر کرنے کے تقریباً سو سال بعد پیدا ہونے والا، ان کا کوئی پڑپوتا اس پورے قصے کو جو اس نے بچپن میں، انھی کے ایک پوتے سے سن رکھا ہے، یہاں

اسی جندر کے خالی گھومتے پاٹوں کی کوک میں، اپنی موت سے چند گھنٹے پہلے اپنے ذہن میں تازہ کر کے انھیں اس بہادری کی داد دے سکے۔

جس طرح راجا کا انھیں جندر تعمیر کرنے کی اجازت دینا اختیاری تھا ــــــ بے شک وہ اپنی شرط ہار چکا تھا، لیکن اگر وہ چاہتا تو اپنے اس وعدے سے پھر بھی سکتا تھا اور کوئی شخص، اسے چیلنج نہیں کر سکتا تھا ــــــ اسی طرح میرا یہاں اس حالت میں مرنا بھی ایک طرح سے اختیاری ہے۔ اگر میں چاہتا تو شہر میں موجود اپنے بیٹے کی شاندار کوٹھی میں بھی مر سکتا تھا کہ وہ دل سے نہ چاہتے ہوئے بھی کئی مرتبہ مجھے ساتھ لے جانے کی کوشش کر چکا ہے؛ اور ایک آدھ مرتبہ تو وہ مجھے اپنے ساتھ زبردستی لے بھی گیا تھا لیکن بیماری اور نقاہت کے باوجود میں وہاں ایک ہی رات بہ مشکل جاگ کر گزار پایا تھا اور اگلے ہی روز اسے بتائے بغیر واپس چلا آیا تھا۔

جب سے وہ افسر بنا ہے اسے کئی لوگوں کی طرف سے طعنے مل رہے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب کچھ عرصہ پہلے جب مجھے دمے کا شدید دورہ پڑا اور وہ مجھے یہاں سے شہر لے گیا تو ڈاکٹر کے پاس جاتے ہوئے اس نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا تھا کہ ابا ڈاکٹر صاحب کو یہ نہ بتانا کہ آپ جندروئی ہیں۔ میں اس کی پریشانی سمجھ گیا تھا اور میں نے گردن ہلا کر فوراً ہامی بھر لی تھی۔ آج یہاں مرتے ہوئے مجھے اس بات کی خوشی بھی ہو رہی ہے کہ آئندہ میرے بیٹے کو کبھی اس طرح کی صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

۵

بابا جمال دین جس نے مجھے یہ کہانی سنائی تھی اگر آج زندہ ہوتا اور اسی طرح چل پھر رہا ہوتا جیسا میں نے اسے اپنے بچپن اور نوجوانی کے دنوں میں دیکھا تھا______اگر چہ یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ ایسی صورت میں اس کی عمر ڈیڑھ سو سال کے لگ بھگ ہوتی______تو مجھے اس بارے میں کسی قسم کی کوئی قیاس آرائی کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی کہ میرے بعد یہاں آنے والا پہلا شخص کون ہوگا؟ بل کہ میرے ذہن میں یہ سوال سرے سے ابھر ہی نہ پاتا۔ مجھے اپنی یقینی موت سے کہیں زیادہ اس بات کا یقین ہوتا کہ میری موت کے بعد بابا جمال دین ہی وہ پہلا شخص ہوگا، جو مجھے مردہ حالت میں دیکھے گا اور گاؤں والوں کو میری موت کے بارے میں مطلع کرے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ مجھ پر نزع کا عالم طاری ہونے سے پہلے ہی اسے اطلاع مل جاتی، بل کہ شاید اس وقت تک وہ میری پیش آمدہ موت سے باخبر ہو چکا ہوتا۔

وہ عمر میں مجھ سے ستر سال بڑا تھا لیکن ہمارے درمیان تعلق ہم عمروں اور ہم جولیوں جیسا تھا۔ جب میں بچہ تھا اور وہ میرے باپ سے ملنے جندر پر آیا کرتا تھا تو وہ مجھ سے بچوں ہی کی طرح توتلی زبان میں بات کیا کرتا تھا اور میرے ساتھ بچوں کی طرح کھیلتا تھا۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود وہ بہت اچھا داستان گو تھا اور جہاں بیٹھتا لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے اور اس سے کہانیاں سنتے۔ اسے بلا مبالغہ سینکڑوں کہانیاں یاد تھیں۔ وہ موقع محل کی مناسبت سے لوک داستانوں اور کہانیوں میں ردو بدل کر کے انھیں اور بھی دلچسپ بنا دیا کرتا تھا۔ اس بات کا پتہ مجھے

بہت عرصے بعد ،اس وقت، جب میں نے لوک کہانیوں کی مختلف کتابیں پڑھیں ،بیشتر کہانیوں کے نہ صرف کردار مختلف تھے بل کہ مقامات اور ماحول بھی مختلف تھا۔میرے بچپن کے دنوں میں، وہ جب بھی ہمارے جندر پر آتا میں اس سے ایک آدھ کہانی ضرور سنتا۔اگر کہانی عام بھی ہوتی تو اس کے سنانے کا انداز اسے خاص بنا دیتا تھا۔کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ اس نے پہلے سنائی ہوئی کہانی دوبارہ سنائی لیکن مجھے اس کے انجام سے پہلے، جو عموماً روایتی ہوتا تھا، پتا ہی نہ چلا کہ یہ وہی کہانی ہے جو میں پہلے بھی اس کی زبانی سن چکا ہوں۔کہانی سناتے ہوئے وہ اپنے سامع کی سوجھ بوجھ ،اور ذہنی سطح کو ضرور ملحوظِ خاطر رکھتا تھا اور اگر سامع ایک سے زائد ہوں اور مختلف ذہنی سطح کے ہوں تو وہ ایسی کہانی کا انتخاب کرتا تھا، جس میں ہر سامع کی دلچسپی کا کوئی نہ کوئی عنصر موجود ہو، یا پھر وہ سب کے لیے یکساں طور پر قابلِ سماعت ہو۔کہانی سناتے ہوئے وہ اپنے تمام سامعین پر نظر رکھتا تھا اور ان کے چہروں کے تاثرات ہی سے اندازہ کر لیتا تھا کہ کون دلچسپی سے سن رہا ہے اور کون اکتاہٹ کا شکار ہو رہا ہے۔پھر اکتاہٹ کا شکار ہونے والے سامع کے ذوق اور مزاج کے مطابق کہانی میں کوئی اضافی واقعہ فٹ کر دیا کرتا تھا اور یہ کام وہ اتنی مہارت سے کرتا کہ کسی کو کانوں کان خبر ہی نہ ہوتی۔

جوں جوں میں بڑا ہوتا گیا اس کا رویہ میری عمر کے حساب سے تبدیل ہوتا گیا اور سنائی جانے والی کہانیوں کی سطح بھی بلند ہوتی چلی گئی۔عام لوک داستانوں اور کہانیوں کے علاوہ کچھ کہانیاں ایسی بھی تھیں جو صرف اسے ہی یاد تھیں۔ایسی کہانیوں میں زیادہ تر کہانیاں تاریخی یا نیم تاریخی واقعات پر مشتمل تھیں اور ان واقعات میں سے زیادہ تر کا تعلق ہمارے علاقے اور بالخصوص ہمارے گاؤں کی آبادکاری سے تھا۔اگر چہ اس نے بعض بہت معمولی نوعیت کے واقعات کو بھی کہانی کا روپ دے دیا تھا لیکن ان کو بھی اس نے اپنے زرخیز تخیل کے ذریعے رنگ آمیزی کر کے قابلِ سماعت بنا دیا تھا۔ بہت سے واقعات ،جنھیں آخری عمر میں اس نے کہانیوں میں ڈھال لیا تھا، خود اس کی اپنی زندگی میں وقوع پذیر ہوئے تھے۔اس کا اندازہ مجھے اس کی موت

کے بہت عرصے بعد ہوا۔

مجھ سے پہلے اس کی میرے باپ سے بھی، جو اس کا سگا بھتیجا تھا، گہری دوستی تھی۔ اپنے باپ کے بعد جس شخص سے، میں سب سے پہلے مانوس ہوا وہ بابا جمال دین ہی تھا۔

''تایا جمال دین ہی نے میرے باپ سمیت تمام چھوٹے بھائیوں کو پالا تھا۔'' ایک دن جب بابا جمال دین جندر سے اٹھ کر گیا تو میرے باپ نے مجھے بتایا تھا۔ میرا دادا اپنے پانچ بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا اور بابا جمال دین ان سب سے بڑا۔ وہ بہت حوصلہ مند شخص تھا۔ میرے دادا سمیت اس کے تمام چھوٹے بھائی جنھیں اس نے اس جندر پر دن رات، محنت مزدوری کر کے پالا تھا، اس کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے اور ان تمام کو اس نے اپنے ہاتھوں سے دفنایا تھا۔ اس کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے وہ اپنے تمام بھتیجوں کو بیٹوں کی طرح اور ان کی اولاد کو پوتوں کی طرح چاہتا رہا تھا۔ اس کے تمام بھائی اور ان کی اولادیں بھی اسے بہت چاہتی تھی اور اس کے ہر حکم کو سر آنکھوں پر رکھتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی ادھیڑ عمری میں جب اس نے ہمارا یہ وراثتی جندر جس میں سب کا حصہ بنتا تھا، پورے کا پورا میرے دادا کے نام کر دیا تو کسی نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔ اپنے بھتیجوں میں میرا باپ جب کہ پوتوں پوتیوں میں، مَیں اس کا سب سے چہیتا رہا تھا۔

میرے باپ کی موت کے بعد وہ واحد شخص تھا جو میری خبر گیری کرنے تقریباً ہر دوسرے روز یہاں آتا اور کہانیاں سنا کر میرا غم ہلکا کیا کرتا تھا۔ سچی بات تو یہ کہ اس دور میں اس کی سنائی ہوئی کہانیوں نے میرا دکھ کم کرنے، مجھے واپس زندگی کے دھارے کی طرف لانے اور میرا حوصلہ بڑھانے میں، بہت مدد کی۔ جب مجھے مطالعے کی عادت پڑی تو وہ بہت خوش ہوا اور ہر روز آنے لگا۔ اب وہ مجھے کہانیاں سنانے کے بجائے الٹا مجھ سے سننے لگا۔ میں اسے ہر روز دو تین کہانیاں پڑھ کر سناتا اور وہ ایک پر تجسس بچے کے سے انداز میں ہر کہانی انتہائی دلچسپی سے سنتا اور ان پر سر دھنتا رہتا۔ اس کی یادداشت قابل رشک تھی، صرف ایک مرتبہ سن کر اسے پوری کی پوری

کہانی معمولی جزئیات سمیت یاد ہو جایا کرتی تھی۔

جب ناول میرے زیرِ مطالعہ آنے لگے تو اس میں ایک نئی زندگی عود کر آئی۔طویل کہانی سننے میں اسے بہت مزہ آتا تھا۔اگر ناول کی ضخامت دو سو صفحات کے لگ بھگ ہوتی تو وہ اسے ایک ہی نشست میں ختم کرنے پر اصرار کرتا۔چوں کہ یہ نشست بسا اوقات بارہ چودہ گھنٹوں سے بھی زائد وقت کو محیط ہوتی اس لیے وہ اس روز رات کو بھی میرے ساتھ جندر پر ہی قیام کرتا اور اس کے بارے میں مجھ سے تبادلہ خیال کرتا رہتا۔زیادہ تر ناول اس نے ایک سے زائد مرتبہ سنے تا کہ ان کا پلاٹ پوری طرح ذہن نشین ہو سکے۔زیادہ ضخیم ناولوں کے ایک دو باب ہی میں اسے سناتا لیکن ایک سے زائد مرتبہ۔

انھی دنوں ہماری اس ٹولی میں میری چچا زاد حاجرہ کا بھی، جو بعد میں میری بیوی بنی، اضافہ ہو گیا، جس نے ان دنوں ہائی سکول میں نیا نیا داخلہ لیا تھا۔اس کے آنے سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ جب پڑھتے ہوئے، میرا دماغ تھکنے لگتا تو میں کتاب اس کی طرف بڑھا دیتا اور اگلا حصہ وہ سنانے لگ جاتی۔علاوہ ازیں کھانے پینے کا انتظام جو پہلے مجھے کرنا پڑتا تھا وہ بھی اسی نے سنبھال لیا تھا۔سکول کے بعد وہ سیدھی جندر پر آ جاتی اور میرا رات کا کھانا تیار کر کے شام کو بابا جمال دین کے ساتھ ہی گھر جاتی۔

اردو کے ناولوں میں بابا جمال دین کا پسندیدہ ناول ''اداس نسلیں'' تھا اور وہ اسے ''آگ کے دریا'' پر ہمیشہ ترجیح دیتا تھا۔مجھے اور حاجرہ دونوں کو اس سے اختلاف تھا اور ہم دونوں کے نزدیک ''آگ کا دریا'' اردو کا سب سے بڑا ناول تھا لیکن بابا جمال دین، اس باب میں ہم سے واضح اختلاف رکھتا تھا اور کہتا تھا کہ ''اداس نسلیں'' میں کہانی زیادہ مربوط ہے اور مجھے اپنی اپنی سی لگتی ہے جب کہ ''آگ کا دریا'' میں کہانی جگہ جگہ سے ٹوٹتی ہے اور کردار بدل جاتے ہیں جس سے مجھے الجھن ہوتی ہے۔کہانی ہو، افسانہ ہو یا ناول، اس کے نزدیک اس میں دل چسپی کا عنصر ہونا ضروری تھا۔

کچھ ہی عرصے میں ہم تینوں نے مل کر اردو کا تمام دستیاب نثری ادب چھان مارا اور پھر عالمی ادب سے جن ناولوں اور کہانیوں کے اردو یا فارسی تراجم اس دور میں دستیاب تھے، تلاش کرنا شروع کر دیے کہ ان دنوں سکولوں میں انھی دو زبانوں میں تعلیم دی جاتی تھی۔ چوں کہ بابا جمال دین فارسی نہیں جانتا تھا اس لیے فارسی کی کتاب کے مطالعے کے لیے ہم دونوں میں سے کوئی ایک پڑھتا اور دوسرا ساتھ ساتھ اس کا اردو میں ترجمہ کرتا جاتا تاکہ بابا جمال دین بھی نہ صرف اسے سمجھ سکے بل کہ اس سے لطف اندوز بھی ہو سکے۔

ان دنوں ہمارے قریبی قصبے میں کتابوں کی ایک ہی دکان تھی، اس کے ہاں ہماری ضرورت اور دلچسپی کی کتابیں تو ایک حد تک دستیاب تھیں لیکن ان میں تراجم نہ ہونے کے برابر تھے۔ شروع شروع میں کتابیں خریدنے مجھے خود پنڈی جانا پڑتا تھا۔ بعد میں، میں نے اس کا یہ حل نکالا کہ اسی دکان کے مالک کو اپنی پسندیدہ کتابوں کی فہرست دے دیا کرتا اور وہ مطلوبہ کتابیں پنڈی سے خرید لاتا۔ یوں تو اس دور میں، ہم نے تقریباً ہر اس زبان کا افسانوی ادب پڑھا، جو اردو یا فارسی میں دستیاب تھا لیکن چچا جمال دین کو میری اور حاجرہ کی سنائی ہوئی کہانیوں میں سے روسی کہانیاں سب سے زیادہ پسند تھیں۔ ان میں سے بہت سی کہانیاں، جو خاصی طویل تھیں، اسے پوری کی پوری زبانی یاد ہو گئی تھیں اور وہ انھیں گاؤں کے لوگوں کو بھی سناتا رہتا تھا، لیکن ایسا کرتے ہوئے وہ صرف پلاٹ برقرار رکھتا؛ کردار، اندازِ بیاں، ماحول اور باقی چیزیں مکمل طور پر تبدیل کر کے ان میں مقامی رنگ بھر دیتا۔ ان مبدل کہانیوں کو اگر احاطۂ تحریر میں لایا جائے تو ممکن ہے پڑھنے والوں کو بالکل پھیکی لگیں لیکن اس کے منہ سے سن کر وہ پہلے سے زیادہ جاندار لگتی تھیں۔ دراصل وہ قابلِ خواندہ کو قابلِ سماعت بنا کر پیش کرتا تھا؛ اس کے ہاں قاری کے بجائے سامع کا تصور تھا۔

اگر مجھے بابا جمال دین کی قربت نصیب نہ ہوتی تو شاید میری زندگی کسی اور ہی نہج پر گزرتی کہ میری ذہنی پرداخت اور کتابوں سے لگاؤ میں ان کہانیوں کا بنیادی کردار ہے، جو اس

نے مجھے میرے بچپن کے دنوں میں سنائی تھیں۔ورنہ جندر کی سریلی گونج، جو شعور کی آنکھ کھولنے تک میرے وجود کا حصہ بن چکی تھی، مجھے کہیں کا نہ چھوڑتی اور میں نفسیاتی مریض بن کر یا تو پاگل پن کی زندگی گزار رہا ہوتا یا پھر مدتوں پہلے ہی مر کھپ چکا ہوتا۔

اب جب کہ کچھ ہی گھنٹوں بعد میری موت یقینی ہے،میرے پاس اس وقت کوئی ایسا ذریعہ نہیں کہ میں گاؤں میں موجود اپنے عزیزوں کو اپنی موت کے بارے میں مطلع کر سکوں۔ اگرچہ اب ہمارے گاؤں میں بھی موبائل فون کی سہولت موجود ہے لیکن میں کبھی اسے اپنے زیر استعمال نہیں لایا کہ ایک تو مجھے کبھی ان چیزوں سے دلچسپی نہیں رہی اور دوسرا جندر والے مقام پر کسی کمپنی کے سگنل ہی نہیں آتے کہ اس کے چاروں طرف پہاڑیاں ہیں۔البتہ اگر بابا جمال دین زندہ ہوتا تو میں بغیر کسی مرئی مواصلاتی رابطے کے اسے مطلع کر سکتا تھا؛ بالکل ایسے ہی جیسے اس نے اپنی موت سے کچھ دیر پہلے مجھے اپنی موت کے بارے میں مطلع کر دیا تھا۔اگر میں نے اس دن ــــــــــ بابا جمال دین کی موت والے دن ــــــــــ لالچ آمیز تساہل نہ برتا ہوتا تو میں یقیناً،اسے آخری سانسیں لیتے ہوئے بھی دیکھ سکتا تھا۔

یہ ایک ایسا قلق ہے جو ساری زندگی میرا پیچھا کرتا رہا۔

٦

گرمیوں کے دن تھے اور رات کا کوئی پہر۔ میں جندر کے صحن میں بنے اونچے تھلے پر لیٹا، ندی کے پُرشور پانیوں سے اٹھکیلیاں کرتی ہوا سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ چاند کی سترھویں یا اٹھارویں تاریخ تھی۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ میری آنکھ لگ چکی تھی یا میں ابھی اونگھ رہا تھا۔ شاید میں سو کر جاگا تھا۔ لفظ ''شاید'' کا سہارا میں اس لیے لے رہا ہوں کہ جب میں تھلے پر لیٹ رہا تھا؛ چاند مشرقی پہاڑی کی چوٹی والے کاہو کے درخت کی سب سے اونچی پھننگوں سے یوں منہ نکال رہا تھا، جیسے کوئی دوشیزہ ندی کے پانی کو آئنہ کیے اپنے منہ پر بکھرے بال سنوار رہی ہو۔ میں کافی دیر، کرنیں بکھیرتے چاند کو کاہو کی سیاہ پھننگوں سے علاحدہ ہوتے دیکھتا رہا اور پھر کروٹ بدل لی تھی۔

میں نہ جانے کتنی دیر آنکھیں بند کیے، کچھ سوچنے کی کوشش کرتا رہا تھا مگر کچھ بھی سوچ نہیں پا رہا تھا۔ میرے دماغ میں بہت سے خیالات اور تصورات آپس میں یوں گڈمڈ ہو رہے تھے، جیسے پینتالیس دن پہلے، اپنی موت کے بعد یہاں آنے والے پہلے شخص کے بارے میں سوچتے ہوئے، میری آنکھوں کے آگے بہت سے چہروں کا کولاژ سا بنا ہوا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے بہت سی تصویریں ایک دوسرے میں مدغم ہو رہی ہیں اور میں، ان میں سے کسی ایک کو دوسری سے جدا نہیں کر پا رہا۔ پھر یکا یک ان تصویروں میں سے ایک تصویر جدا ہوئی؛ پہلے وہ ایک غیر واضح سے ہیولے میں ڈھل کر میری آنکھوں کے آگے سرسراتی رہی اور پھر بابا جمال دین کا ہنستا

مسکراتا چہرہ میری بند آنکھوں کے سامنے لہرانے لگا۔

بابا جمال دین کا خیال آتے ہی باقی تمام خیالات اور تصورات میرے دماغ سے یوں غائب ہو گئے تھے، جیسے ان کا کبھی کوئی وجود ہی نہ رہا ہو، مگر اس خیال نے بھی لحہ بھر ہی میرا ساتھ دیا۔ اگلے ہی لمحے میرا دماغ اس خشک ندی کی طرح ہو گیا جس میں پانی تو کجا نمی کا بھی احساس تک نہ ہو۔ میں ادھر ادھر سے خیالات کے بہاؤ کو موڑ کر دماغ کی ندی میں ڈالنے کی کوشش میں جت گیا تا کہ سوچوں کا جندر پھیر سکوں لیکن ہر بار بند ٹوٹ جاتے اور میری سوچوں کا جندر رکا ہی رہ جاتا۔

ابھی میں اسی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ مجھے جندر کے پچھواڑے واقع سات قدمی زینے پر سے کسی کے اترنے کی آہٹ سنائی دینے لگی، جو جندر کی سریلی گونج کے ساتھ کبھی آہستہ اور کبھی تیز ہو رہی تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر کے کان ان آہٹوں پر لگائے تو مجھے یوں لگا جیسے یہ آہٹیں سات قدمی زینے پر سے نہیں، میرے دماغ کی گہرائیوں میں سے ابھر رہی ہیں۔

''شاید کوئی خیال میرے دماغ میں اپنے پیر جمانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس کی آواز مجھے جندر کے پچھواڑے سے آ رہی ہے۔'' میں ابھی اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ مجھے اپنے شانوں پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا اور میں سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک لرز کر رہ گیا۔

''کووون؟'' میں نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر لرزتی آواز میں پوچھا۔

''میں ہوں بیٹا!!!۔ جمال دین۔'' ایک چھوٹی موٹی سی آواز، ندی کے اس پار والے ٹیلے سے ٹکرا کر شاں شاں کرتے پانی پر تیری۔۔۔۔ اور دیر تک تیرتی رہی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میرے سرہانے موجود، کاہو کے ٹیڑھے میڑھے تنے کے ساتھ بابا جمال دین کھڑا تھا۔

''بابا۔۔ آپ اور اس وقت۔۔۔؟ خیریت تو ہے۔۔۔؟'' میں نے بہ مشکل پوچھا۔ الفاظ میرا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔

''ہاں خیریت ہی ہے۔ بس میں تجھے ایک اہم خبر دینے آیا ہوں۔'' اس نے سپاٹ

لہجے میں کہا۔

''کیسی خبر؟''میری آواز کانپ رہی تھی۔

''اپنی موت کی خبر۔''اس نے اپنا سارا وزن اپنی لاٹھی پر ڈالتے ہوئے کہا۔میں نے بے اختیاری میں،اپنا منہ گھما کر چاند کی طرف دیکھا، جو کاہو کی پھننگوں سے خاصا بلند ہو چکا تھا، اتنا بلند کہ اگر کاہو اپنے قد سے دوگنا بھی ہو جاتا تو بھی اس کی سیاہ پھننگیں اس تک نہ پہنچ پاتیں۔

''اچھا۔آپ بیٹھیں۔''یہ کہتے ہوئے میں نے اسے پکڑ کر تھلے پر بٹھایا۔سچی بات تو یہ ہے کہ اسے چھونے سے پہلے مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار ہی نہیں آ رہا تھا اور اسے پکڑ کر بٹھانے کے بہانے ، میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ واقعی موجود ہے یا نہیں۔ان دنوں گاؤں کے دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی گھوڑی ڈینچ نامی ایک خلائی مخلوق کی موجودگی پر یقین رکھتا تھا،جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ انسان سمیت ہر قسم کا روپ دھار لیتی ہے اور ہاتھ لگاتے ہی غائب ہو جاتی ہے۔

میرے بچپن کے دنوں میں بابا جمال دین نے گھوڑی ڈینچ کے حوالے سے مجھے بے شمار کہانیاں سنائی تھیں۔ان میں سے زیادہ تر کہانیوں کا مرکزی کردار وہ خود ہی تھا۔

''گھوڑی ڈینچ انسانوں کا بھیس کر بدل مجھے اکثر ستاتا اور ڈراتا رہتا ہے مگر میرا دل مضبوط ہے اس لیے وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔اگر کبھی تمھارا اس سے سامنا ہو جائے تو ڈرنا مت، بس اسے ہاتھ لگانے کی کوشش کرنا۔جوں ہی تم اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاؤ گے وہ خود بخود غائب ہو جائے گا۔''بابا جمال دین نے مجھے کئی بار بتایا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ اسے چھونے سے پہلے مجھے پورا یقین تھا کہ وہ گھوڑی ڈینچ ہی ہے لیکن جب وہ چھونے کے باوجود غائب نہ ہوا تو میری روح تک لرز کر رہ گئی۔

''یہ کیسے ممکن ہے۔وہ یہاں کیسے آ سکتا ہے اور وہ بھی اس وقت؟وہ تو پچھلے کئی دنوں سے چارپائی پر پڑا ہوا ہے اور اس کا چلنا پھرنا سرے سے موقوف ہے۔''میں نے دل ہی دل میں

سوچا؛ مگر ناممکن، ممکن الوجود ہو چکا تھا اور اب میرے پاس اس بات پر یقین کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ میرے سامنے کھڑا ہیولا بابا جمال دین ہی ہے۔

کچھ ہی دیر میں میرے لیے یہ سوال اتنا اہم نہیں رہا تھا کہ وہ یہاں آ کیسے گیا؟ اہم بات یہ تھی کہ اسے واپس گھر کیسے لے جایا جائے۔ میں کافی دیر اس کے پاس کھڑا اس بارے میں سوچتا رہا پھر کمرے کے اندر جا کر جندر پر چڑھی چونگ دیکھی۔ کھارے میں ابھی آٹھ دس کلو دانے باقی تھے، جنھیں پیسنے کے لیے کم از کم آدھا گھنٹا درکار تھا۔ میں نے سوچا کہ جوں ہی چونگ ختم ہو گی، میں جندر ''بار'' دوں گا اور بابا جمال دین کو کاندھے پر اٹھا کر گھر لے جاؤں گا اور صبح سویرے ہی واپس پلٹوں گا۔ اگرچہ میری نیند کے حوالے سے یہ ایک مشکل فیصلہ تھا لیکن اب اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔

میں نے جب باہر آ کر اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ خاموش رہا اور میری طرف یوں دیکھنے لگا جیسے وہ واپس جانے سے گریزاں ہو۔ میں بھی خاموشی سے اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور اس سے کسی قسم کی بات چیت کرنے سے گریزاں رہا کہ مبادا وہ پھر سے اپنی موت کا ذکر چھیڑ دے اور میرا جی گھبرانے لگے اور مجھے اس کی وہاں موجودگی سے اُنس محسوس ہونے کے بجائے خوف آنے لگے۔

جوں ہی دانے ختم ہوئے اور جندر کی آواز تبدیل ہوئی، میں بھاگا بھاگا جندر کے کمرے میں گیا اور لکڑی کی کیل کھینچ دی تاکہ دونوں پاٹ آپس میں رگڑ نہ کھائیں اور کوچی لے کر کھائی میں بکھرا ہوا آٹا سمیٹنے لگا۔ میں آٹا بوری میں ڈال کر بوری سینے کے لیے سُوا ڈھونڈ رہا تھا کہ مجھے اپنے چچا زاد اورنگزیب کی آواز سنائی، جوندی کے اس پار واقع اونچے ٹیلے پر سے، جہاں سے گاؤں والے آوازہ بلند کر کے گاؤں میں ہونے والے کسی واقعے کی اطلاع دیا کرتے تھے اور میں نے اس کا نام ڈاک ٹیلا رکھا ہوا تھا، مجھے پکار رہا تھا۔

یہ ٹیلا اگرچہ خاصا بلندی پر واقع ہے لیکن جندر کے دروازے کے بالکل سامنے ہونے

کی وجہ سے، وہاں کھڑے ہو کر پکارنے والے کی آواز کمرے کے اندر بیٹھے ہوئے بھی بآسانی سنی جا سکتی تھی بہ شرطے کہ سننے والے کی توجہ جندر کی گونج کی طرف نہ ہو۔ اورنگزیب کی آواز سنتے ہی میرے وجود میں خوشی کی لہر تیر گئی۔ بابا جمال دین کو گھر لے کر جانا اب آسان ہو گیا تھا کہ ہم دونوں اسے چارپائی پر ڈال کر بھی آسانی سے گھر پہنچا سکتے تھے۔

''ممکن ہے اورنگزیب بابا ہی کو ڈھونڈنے آیا ہو۔'' یہ سوچتے ہوئے میں خوشی کے مارے اچھل کر کھائی سے باہر نکلا، ایک نظر بابا جمال دین کے چہرے پر ڈالی، جو بدستور تھلے پر لیٹا، جہاں میں نے اسے لٹایا تھا، چاند کو کاہو کی چوٹی سے مزید دور ہوتا دیکھ رہا تھا۔ میں نے ٹیلے کی طرف کان لگائے، جہاں سے کچھ ہی دیر پہلے اورنگزیب کی آواز بلند ہوئی تھی، لیکن وہاں چپ کا راج تھا۔

''یقیناً میرے کان بج رہے ہوں گے۔ اورنگزیب اپنے گھر لیٹا خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہوگا۔'' میں مایوس ہو کر واپس کمرے کی طرف پلٹ ہی رہا تھا کہ مجھے سامنے کی پگ ڈنڈی پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

'' کون ؟'' میں نے آوازہ بلند کیا۔ میری آواز کی گونج سامنے والے ٹیلے سے ٹکرا کر، میرے کانوں میں گونجی۔

''اورنگزیب ہوں۔ کتنی دیر سے آوازیں دے رہا ہوں۔'' ڈاک ٹیلے کے نیچے موجود جھاڑیوں سے غصے بھری آواز ابھری اور کچھ دیر کے لیے قدموں کی چاپ تھم گئی، شاید میری آواز سن کر وہ رک گیا تھا۔

اس نے ڈاک ٹیلے پر کھڑے ہو کر مجھے کئی بار پکارا ہوگا لیکن اس کی آواز جندر کی کوک میں دب گئی ہوگی اور پھر میری طرف سے جواب نہ ملنے پر ہی، اس نے اتر کر نیچے آنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ اب وہ جندر کے بہت قریب آ چکا تھا اور اس کی آواز بہت واضح ہو گئی تھی۔

''جلدی کرو۔ باہر پڑا سامان سمیٹ کر اندر رکھو۔ بابا جمال دین کی طبیعت زیادہ خراب

ہوگئی ہے۔انھیں حکیم صاحب کے پاس لے جانا پڑے گا۔“اس نے قدموں کی رفتار تیز کرتے ہوئے کہا۔

”بابا جمال دین ن ن ؟ وہ تو یہاں ہیں۔“میں نے بابا جمال دین کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ،جن کی آنکھوں میں شرارت کی چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کی چاندنی بکھری ہوئی تھی۔

”لگتا ہے رات دن کتابیں پڑھ پڑھ کر تیرا دماغ چل گیا ہے۔“اس نے سات قدمی زینے پر قدم رکھتے ہوئے کہا۔اگلے ہی لمحے وہ صحن میں اتر چکا تھا۔

”تم کیا الٹی سیدھی ہانک رہے تھے۔کبھی کہانیوں کی دنیا سے باہر بھی نکل آیا کرو۔“ اس نے مجھے جھڑ کا اور صحن عبور کر کے جندر کے دوسرے پچھواڑے کی جانب بھاگتا ہوا چلا گیا۔کچھ ہی دیر میں جندر کی کوک پانی کے شور میں دب چکی تھی کہ وہ لکڑی کے پشتے کو اکھاڑ کر پانی موڑ چکا تھا۔

میں نے مڑ کر تھلے کی طرف دیکھا تو وہاں صرف چاندنی کا اندھیر تھا۔میں نے اس اندھیر میں کچھ سوچنے کی کوشش کی مگر میرا دماغ پھر سے خشک ندی کی طرح ہو گیا ،جس میں کسی خیال کا کوئی قطرہ تو کجا ،وتر بھی نہیں تھا۔

اورنگزیب نے جلدی جلدی جندر کے دروازے کو تالا لگایا اور واپس سات قدمی زینے کی طرف قدم بڑھانے لگا۔میں بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

قریباً آدھے گھنٹے بعد ہم پہاڑ کی چوٹی عبور کر کے گاؤں میں داخل ہو رہے تھے کہ اچانک بینوں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوگئیں۔کچھ ہی دیر بعد ہم چچا کے گھر میں تھے ،جہاں بابا جمال دین کی میت چارپائی پر رکھی ہوئی تھی۔میں نے میت کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی چاندنی بکھری ہوئی تھی لیکن میں اس کی آنکھوں میں شرارت کی چمک نہ دیکھ سکا کہ انھیں میرے پہنچنے سے پہلے ہی بند کیا جا چکا تھا۔

میں آج تک حیران ہوں کہ اگر بابا جمال دین کا، جندر پر آنا محض میرا واہمہ تھا تو پھر میں نے اسے چھوا کیسے تھا۔

میں نے بعض بزرگوں کے ملفوظات میں پڑھا ہے کہ وہ بیک وقت کئی جگہوں پر موجود رہ سکنے پر قادر تھے۔ بابا جمال دین بھی شاید انھی میں سے تھا۔ میں کوئی ایسا صاحب کرامت نہیں ہوں کہ کسی کو بذریعہ خواب اپنی یقینی موت کے بارے میں مطلع کر سکوں۔ ہاں اگر بابا جمال دین زندہ ہوتا تو شاید۔۔۔۔

۷

آوازوں کے صرف نام رکھے جاسکتے ہیں؛ان کی کوملتا یا کرختگی کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایک ایسا شخص جس نے زندگی بھر کبھی کوئل کی کوک نہ سنی ہو،صرف اس کے بارے میں کتابوں میں پڑھا ہو،کبھی نہیں جان سکتا کہ اس کی ماہیت کیا ہوتی ہے۔

جن لوگوں نے گھومتا جندر دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ جب گھومتے پاٹوں کے اوپر لٹکی نالی سے پاٹوں کے سوراخ میں دانے گر رہے ہوتے ہیں تو اس کی گونج میں ایک خمار بھری سرشاری ہوتی ہے۔چوں کہ یہ سرشاری صرف محسوس کی جا سکتی ہے ____ اسے بیان نہیں کیا جا سکتا ____ اس لیے اگر آپ نے کبھی جندر کے گھومتے ہوئے پاٹ نہیں دیکھے تو اس کی سرشاری سے کبھی آشنا نہیں ہو سکتے؛اور نہ درد بھری اس کوک کے بارے میں جان سکتے ہیں جو اس وقت سننے کو ملتی ہے جب جندر کا کھارا خالی ہوتا ہے اور اسے اس کا دانہ پانی نہیں مل رہا ہوتا۔جوں ہی دانوں والی نالی کے ساتھ لٹکا لکڑی کا ٹکڑا، جو نالی کو تھرتھرانے کی غرض سے (تا کہ اس کی تھرتھراہٹ سے نالی ہلتی رہے اور دانے نیچے گرتے رہیں) گھومتے پاٹ کے اوپر رکھا ہوتا ہے،اوپر اٹھایا جاتا ہے،یہ خمار بھری گونج، یک دم درد اور ریاسیت بھری کوک میں تبدیل ہو جاتی ہے اور کچھ دیر تک اسے مسلسل سنتے رہنے کے بعد یہ کوک آپ کو اپنے وجود کی گہرائیوں سے اٹھی ہوئی ہوک معلوم ہونے لگتی ہے۔

میں کہ ساری زندگی جندر کی خمار بھری سریلی گونج سننے کا عادی رہا،گزشتہ پینتالیس

دنوں سے، روح تک کے بخیے ادھیڑ دینے والی، اس کی یہ دکھ بھری کوک سن رہا ہوں اور اب یہ مجھے جندر کے پاٹوں کے درمیان سے نہیں اپنے معدوم ہوتے وجود کی گہرائیوں سے اٹھتی ہوئی محسوس ہورہی ہے۔ یہ کوک اتنی شدید ہے کہ میرا گوشت؛ جس کا دمے جیسا موذی مرض بھی، جو ہر جندروئی کا مقدر ہوتا ہے، کچھ نہیں بگاڑ پایا تھا اور جو کچھ دن پہلے تک، میری ہڈیوں پر یوں کسا ہوا تھا کہ ستر سال سے اوپر کا ہونے کے باوجود، سوائے ماتھے کے میرے چہرے پر ایک شکن بھی نہیں ابھری تھی؛ اس کی شدت نے ان چند ہی دنوں میں اسے ہڈیوں سے علاحدہ کر کے رکھ دیا ہے؛ اور میں جو پینتالیس دن پہلے تک، پینتالیس پچاس سال کا ادھیڑ عمر آدمی لگتا تھا؛ صرف ان پینتالیس ہی دنوں میں، چوراسی پچاسی برس کا انتہائی نحیف و نزار بوڑھا لگنے لگا ہوں؛ اور گزشتہ تین دنوں سے اس میں اتنی تیزی آ گئی ہے کہ اب تو گھومتے پاٹ کے ہر چکر پر میں اپنے گوشت کے ریشوں کو ہڈیوں سے علاحدہ ہوتے ہوئے باقاعدہ محسوس بھی کر سکتا ہوں۔

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ میں نے گھومتے جندر کی سریلی گونج پہلی دفعہ کب سنی۔ میرے باپ کے بقول جب مجھے پہلی بار یہاں لایا گیا تھا اس وقت میری عمر تین سال کے لگ بھگ تھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میں یہ گونج اس سے پہلے بھی کہیں سن چکا تھا؛ شاید ماں کے پیٹ میں۔

مجھے یقین ہے کہ جب میں اپنے باپ کی پشت سے ماں کے رحم میں منتقل ہوا اور اس کا پاؤں بھاری پڑا تو زچگی سے پہلے کے ایک دو ماہ کو چھوڑ کر وہ میرے باپ کو کھانا دینے یہاں آتی رہی ہوگی اور میرے کان، جو ابھی اپنی تشکیل کے ابتدائی مرحلے میں ہوں گے، یہ سریلی گونج محسوس کرتے رہے ہوں گے۔ اگرچہ میرے باپ نے کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا____ گو کہ وہ ؛ ہر وہ بات جس کا تعلق میری ماں سے ہو پوری جزیات کے ساتھ مجھے بتا دیا کرتا تھا____ لیکن پھر بھی مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور آتی رہی ہوگی اور یہاں میرے سامنے والے تھلے پر بیٹھ کر میرے باپ کو کھانا کھاتے دیکھتی اور جندر کی سریلی گونج سے لطف اندوز ہوتی رہی ہوگی۔ مجھے یہ بھی یقین

ہے کہ جب میرا باپ آہستہ آہستہ چبا چبا کر کھانا کھا رہا ہوتا ہوگا ________ کہ میں نے ہمیشہ اسے اسی طرح کھانا کھاتے دیکھا________ تو وہ نیچے کھائی میں اتر کر جندر کے پاٹوں کے آگے جمع شدہ گرم گرم آٹا بھی بوریوں میں ڈالتی رہی ہوگی کہ میں نے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک، بوریوں میں آٹا ڈالتے ہوئے ہینکڑوں مرتبہ اس کا لمس محسوس کیا۔ یہاں تک کہ پینتالیس دن پہلے؛ اس وقت بھی جب میں آخری چونگ پیس کر پسا ہوا آٹا بوری میں ڈال رہا تھا، موت کے ساتھ ساتھ، میں نے اس کا ہاتھ بھی اپنے شانے پر محسوس کیا تھا اور تب سے یہ کسی بھی لمحے میرے شانے سے جدا نہیں ہوا۔ حالاں کہ میرے باپ کے بقول میری پہلی سانس اس کی آخری ہچکی ثابت ہوئی تھی۔

## ۸

''شادی کے بعد پانچ سال تک ہمارے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔''میرے باپ نے مجھے بتایا تھا۔''اور جب ہماری شادی کو دو سال گزر چکے اور تمھاری دادی کو پوتے پوتی کی خوش خبری نہ مل سکی تو اس نے میری دوسری شادی کرانے کی کوششوں کا آغاز کر دیا۔چوں کہ ہمارا جندر بارہ مہینے چلتا تھا اور میں دن رات محنت کرتا تھا اس لیے گاؤں میں ہماری زرعی زمین بہت کم ہونے کے باوجود بھی ہمارے مالی حالات دوسروں سے اچھے تھے۔مالی حالات کی بہتری کی وجہ سے کئی لوگ دوسری شادی کے لیے بھی مجھے رشتہ دینے پر رضامند تھے کہ بھوک اور افلاس کی کثرت کے باعث زیادہ تر والدین، رشتہ طے کرتے ہوئے صرف یہ دیکھتے تھے کہ ان کی بیٹی کو کہاں بہتر نان نفقہ ملے گا۔ایک آدھ رشتہ تو ایسا بھی آیا کہ میرا دل للچا اٹھا اور میں نے دل ہی دل میں دوسری شادی کا ارادہ باندھ لیا؛ اگر چہ میں نے ابھی رضامندی کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن تمھاری ماں، جو میرے دل میں پیدا ہونے والے خیالات سے بھی آگاہ ہو جایا کرتی تھی، فوراً بھانپ گئی اور اس کا چہرہ یک دم اتر گیا۔میں نے اک نظر اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور اگلے ہی لمحے انکار کا فیصلہ کر لیا۔اگلے دو روز ہم دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں نہیں دیکھا؛ میں نے شرمندگی کی وجہ سے اور اس نے دکھ کی وجہ سے۔تیسرے روز جوں ہی اس نے میری آنکھوں میں دیکھا، اس کے چہرے پر دوبارہ وہی رونق ابھر آئی جو ہمیشہ اس کے چہرے کا خاصہ رہی تھی۔شاید میرے بتائے بغیر ہی اس نے میری آنکھوں سے جان لیا تھا کہ میں اپنے ارادے سے باز

آ چکا ہوں۔

ادھر میری ماں کا اصرار جاری رہا۔ جب بھی ہم گھر میں بیٹھتے؛ موضوع چاہے جندر کے پاٹ کی تبدیلی ہو، فصل کی کٹائی یا بوائی ہو، یا گابھن گائے کی زچگی؛ اس کی تان آ کر میری دوسری شادی پر ہی ٹوٹتی تھی اور تمھاری ماں اس کا جواب میری آنکھوں میں تلاش کرتی۔ اگر چہ ہر بار اسے وہاں سے نفی ہی میں جواب ملتا لیکن جب میری ماں کا اصرار حد سے بڑھنے لگا تو تمھاری ماں کے دل میں ایک خوف سا بیٹھ گیا تھا کہ اماں اس پر سوتن لا کر ہی چھوڑے گی۔ اس خوف نے اس کے شاداب چہرے پر اپنی پیلاہٹ بکھیرنا شروع کر دی۔ جوں جوں میری ماں کا اصرار بڑھتا گیا تمھاری ماں کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ یہاں تک کہ اس کا شاداب چہرہ کاہو کے زرد پتے کی طرح ہو گیا اور اس کے چہرے کی طرف دیکھنا میرے لیے ناممکن ہو گیا۔ مجھے حیرت تو اس وقت ہوئی جب کچھ ہی عرصے بعد یک دم اس نے پینترا بدلا اور میری دوسری شادی پر اصرار کرنا شروع کر دیا۔

'میں چاہتی ہوں ہماری اولاد ہو؛ اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب تم دوسری شادی کرو۔' اس نے دلیل گھڑی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ یہ الفاظ، جو اس کے منہ سے ادا ہو رہے ہیں، اس کے نہیں، میری ماں کے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ بادلِ نخواستہ ہی مجھے دوسری شادی کی اجازت دے رہی ہے؛ لمحہ بھر کے لیے اسی لڑکی کا چہرہ میرے ذہن میں لہرایا تھا، جس کا رشتہ آتے ہی میرے دل میں پہلی مرتبہ دوسری شادی کرنے کا خیال ابھرا تھا۔ اس لڑکی کے چہرے کو ذہن میں تصویر کر کے میں نے دوبارہ تمھاری ماں کی آنکھوں میں جھانکا تو مجھے لگا کہ جیسے وہ میرے ذہن میں موجود اس لڑکی کی تصویر کو نہ صرف دیکھ رہی ہے بلکہ اگر میں نے اسے مزید کچھ دیر اپنے ذہن میں ٹھہرائے رکھا تو تمھاری ماں مر جائے گی۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اسی وقت عمر بھر کے لیے دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور آج تک اس فیصلے پر قائم ہوں۔

وقت گزرتا رہا، ماں کا اصرار، میرے مسلسل انکار کی وجہ سے آہستہ آہستہ دھیما پڑتا گیا اور پھر ہماری شادی کے پانچویں سال ایک معجزہ رونما ہوگیا؛ تم اس کی کوکھ میں اتر آئے اور اس کا چہرہ یک دم پھر سے کھل اٹھا اور اس کے دل میں شگوفے پھوٹنے لگے۔

'وہ آگیا ہے۔' ایک دن اس نے کھنکھناتی ہوئی آواز میں مجھے بتایا تھا۔ میں نے اس کی آواز میں خوشی کی کھنکھناہٹ تو محسوس کی تھی لیکن میں ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ پھر جب اس نے شرماتے ہوئے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کیا تھا تو مجھ پر شادیِ مرگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ تمھیں شاید یہ بات بری لگے مگر سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے تمھارے پیدا ہونے سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ اب اماں میری دوسری شادی پر اصرار نہیں کرے گی اور تمھاری ماں کو سوتن کا دکھ نہیں سہنا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خبر میں نے سب سے پہلے اپنی اماں تک پہنچائی تھی؛ اسے تو یقین ہی نہیں آیا تھا۔ یقین آتا بھی کیسے؟ وہ تو میری شادی کے دوسرے ہی سال سے تمھاری ماں کو بانجھ سمجھنا شروع ہوگئی تھی۔ چناں چہ اس نے فوراً دائی کو بلوایا تھا۔ دائی کی تصدیق کے بعد بھی وہ یقین نہیں کر پا رہی تھی۔ اسے مکمل یقین چند ماہ بعد ہی آیا۔ بہو کی گود ہری ہونے کی خوش خبری سن کر وہ خوش تو بہت تھی لیکن وہ کئی دن تک ہم سے شرمندہ شرمندہ ہی رہی تھی۔ پھر تمھاری ماں ہی نے اس کی شرمندگی دور کی تھی۔ یہ کہہ کر کہ ماں اس وقت تم اپنے اس فیصلے میں حق بہ جانب تھیں اور تم یہ سب کچھ ہمارے ہی بہتر مستقبل کے لیے کر رہی تھیں۔

ولی خان! یہ جو تمھارا نام ہے ناں؛ اسی کا تجویز کردہ ہے اور تم یقین نہیں کرو گے کہ یہ نام اس نے اسی دن تجویز کر لیا تھا، جس دن اسے پتا چلا تھا کہ تم اس کی کوکھ میں اتر آئے ہو۔

''اگر بیٹی ہوئی تو؟'' میں نے فوراً جرح کی تھی۔ ''نہیں بیٹا ہی ہوگا۔'' اس نے کہا تھا۔ ''میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں۔ میں تمھیں اس کے خدوخال تک بتا سکتی ہوں۔'' اس کے لہجے میں ایسا اعتماد تھا کہ اگلے ہی لمحے مجھے بھی کچھ کچھ یقین سا ہوگیا تھا لیکن ویسا نہیں جیسا تمھاری ماں کو تھا؛ وہ اس حوالے سے عین الیقین کے درجے پر تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی چال ڈھال

میں ایک واضح تبدیلی آ گئی تھی اور اس کے چہرے کی شادابی میں ایک غرور آمیز بانکپن کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جیسے پوری دنیا اس کی دسترس میں آ گئی ہو۔

تمھاری پیدائش سے کوئی مہینہ بھر پہلے اس نے مجھے کہا تھا کہ بازار جا کر کپڑا لے آؤ تا کہ میں بچے کے جوڑے سی سکوں۔ میں بازار گیا تو احتیاطاً زنانہ کپڑا بھی لے آیا تھا تا کہ اگر لڑکی پیدا ہو تو وقتی طور پر کوئی پریشانی نہ اٹھانا پڑے۔

'لڑکی کے کپڑے کیوں لے آئے ہو؟' اس نے میرے ہاتھ میں زنانہ کپڑے دیکھتے ہی کہا تھا۔ اس کے لہجے میں سخت برہمی اور غصہ تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی دفعہ اسے اتنے غصے میں دیکھا تھا۔ اس نے پھول دار زنانہ کپڑے، میرے ہاتھ سے لے کر زمین پر پٹخ دیے تھے اور مردانہ کپڑا سینے سے لگا لیا تھا، جو اگلے دو ہی دنوں میں تمھارے ننھے منے جوڑوں کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

اگر چہ تم ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے لیکن اس نے مجھے تمھارے خد و خال تک بتا دیے تھے یہاں تک کہ تمھارے گال پر موجود اس تل کے بارے میں بھی، جو مجھے ہمیشہ اس کی یاد دلاتا ہے۔ 'میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ہمارا بیٹا گورا چٹا اور گول مٹول ہے اور اس کے گال پر ویسا ہی تل ہے جیسا میرے گال پر ہے۔' اس نے کہا تھا؛ اور جب تم پیدا ہوئے تو تم بالکل ویسے ہی تھے جیسا اس نے بتایا تھا۔ لیکن وہ تجھے نہ دیکھ سکی۔ تمھاری دائی نے مجھے بتایا تھا کہ جیسے ہی تم نے پہلی سانس لی، اس کی سانس ختم ہو گئی تھی۔ میں حیران ہوں کہ تمھارے گال پر موجود تل تک کے بارے میں بتا دینے والی اپنی موت کے بارے میں مجھے کیوں نہ بتا سکی۔ کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ وہ سب جانتی تھی لیکن مجھے اس بارے میں بتانا نہیں چاہتی تھی۔

مرنے کے بعد اس کا چہرہ کیسا تھا؟ شاداب یا پیلاہٹ زدہ۔ مجھے کچھ پتا نہیں کہ میں اُس کا آخری دیدار نہیں کر سکا تھا۔ جب اسے کفنا کر صحن میں دیدارِ عام کے لیے لایا گیا تھا تو میرا بہت جی چاہ رہا تھا کہ میں اسے دیکھوں کہ مرنے کے بعد اس کا چہرہ کیسا ہے مگر یہ کہہ کر مجھے اس کا

چہرہ دیکھنے سے روک دیا گیا تھا کہ وہ اب میرے لیے غیر محرم ہو چکی ہے اور اس کا چہرہ دیکھنا اب میرے لیے شرعاً جائز نہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ مرنے کے بعد بھی اس کے چہرے پر وہ شادابی رہی ہوگی جو تمھارے اس کے کوکھ میں اترنے سے تمھاری پیدائش تک اس کے چہرے پر متواتر رہی تھی۔ نو مہینے کی یہ شادابی کم از کم نو دن تو قبر میں بھی اس کے چہرے پر رہی ہوگی۔

دو ماہ کم تین سال تک تجھے تیری دادی نے پالا۔ جب وہ چل بسی تو میں تجھے اپنے ساتھ جندر پر لے آیا تھا۔ تم نے پہلی دفعہ جندر کے گھومتے پاٹ دیکھے تو بہت خوش ہوئے تھے؛ اتنے خوش کہ اس کے بعد میں نے آج تک تجھے اتنا خوش نہیں دیکھا۔'' میرے باپ نے مجھے بتایا تھا۔

## ۹

مجھے یقین ہے کہ میں نے دو ماہ کم تین سال کی عمر میں جب پہلی دفعہ گھومتے جندر کا نظارا کیا ہوگا، اس کا کھاراداتوں سے لبالب بھرا ہوگا اور اس کی گونج میں وہی سرشاری ہوگی جس کا میں ساری زندگی اسیر رہا اور اب جسے گزشتہ پینتالیس دنوں سے مسلسل ترس رہا ہوں۔ تبھی تو میں، بقول اپنے باپ کے، خوش ہوا تھا ورنہ مجھے اس کی آواز کبھی خوش نہ آتی؛ بل کہ ویسی ہی لگتی جیسی اب لگ رہی ہے: کرب آمیز، تلخ اور کرخت؛ اور میں بجائے خوش ہونے کے رو پڑتا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ وہی اولین سرشاری تھی جس نے مجھے ساری زندگی جندر کے گھومتے پاٹوں سے باندھے رکھا۔ مجھے افسوس ہے کہ اس اولین سرشاری کی کوئی جھلک کبھی میرے حافظے میں نہیں ابھر پائی۔

میری زندگی کی پہلی یاد اس بکری کے دو سینگوں سے جڑی ہوئی ہے جسے _____ جیسا کہ میرے باپ نے مجھے بتایا تھا _____ میری ماں نے اپنی موت سے کوئی چار پانچ ماہ پہلے خریدا تھا اور دادی کی وفات کے بعد جب میرے باپ نے مجھے جندر پر ساتھ لے آنے کا منصوبہ بنایا تو اسے بھی ساتھ لے آیا کہ اب گھر میں اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ جندر پر آنے کے کچھ عرصے بعد بکری نے دو بکروٹے دیے۔ جنھوں نے میری تنہائی کو ایک حد تک کم کر دیا۔ بکری صحن میں موجود، کانُو کے درخت کے ساتھ، جو، ان دنوں میرے باپ کی طرح جوان تھا ، بندھی رہتی جب کہ اس کے بکروٹے صحن میں گھومتے رہتے اور میں سارا سارا دن ان کے ساتھ

کھیلتا رہتا۔ بکری کے تھنوں پر ہر وقت ایک تھیلی سی چڑھی رہتی تا کہ بکروٹے میرے حصے کا بھی دودھ نہ پی جائیں۔ ایک دن میں بکروٹوں کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ بکری نے مجھے اپنے سینگوں پر اٹھا کر پٹخ دیا۔ میرے باپ نے، جو غالباً اس وقت آٹا سمیٹنے والی کو چی لے کر جندر کی کھائی میں اترا ہوا تھا، جب میرے رونے کی آواز سنی تو بھاگتا ہوا آیا اور مجھے اٹھانے سے پہلے بکری پر پل پڑا۔ یہ پہلا اور آخری موقع تھا جب میں نے اسے غصے میں دیکھا۔ اس کے بعد وہ کئی دنوں تک بکری کو سہلاتا اور پیار کرتا رہا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب کچھ عرصے بعد یہی بکری تھلے پر چڑھنے کی کوشش میں گلے میں پڑی رسی سے لٹک کر مرگئی اور میں سہمے ہوئے انداز میں مری ہوئی بکری کو دیکھ رہا تھا تو میرا باپ مجھے سینے سے لگا کر بہت دیر تک روتا رہا تھا۔ شاید اسے میری ماں کی سونپی ہوئی نشانی پر اتارا گیا اپنا غصہ یاد آ گیا تھا، ورنہ عام حالات میں، میں نے اسے کبھی روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بابا جمال دین نے تو مجھے یہاں تک بتایا تھا کہ وہ میری ماں کے مرنے پر بھی بالکل نہیں رویا تھا الٹا دوسرے رونے والوں کو دلاسے دیتا پھرتا رہا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر تیرا باپ اس دن جی بھر کر رو لیتا تو جوانی میں نہ مرتا۔

میری ماں کی موت کے بعد اس نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ تاہم جب تک وہ زندہ رہا، اس نے میرا ہر طرح سے خیال رکھا۔ میں نے اسے ہمیشہ ایک خاموش طبع، اپنے آپ میں گم اور اپنے کام سے کام رکھنے والا شخص پایا۔ وہ سوائے بابا جمال دین کے کسی سے کم ہی بات چیت کرتا تھا۔ اگر بابا جمال دین اسے نہ کہتا تو شاید مجھے سکول میں داخل کرانے کا بھی اسے خیال نہ آتا۔

مجھے سکول میں داخل کرانے کی طرف اس کی توجہ بے شک بابا جمال دین ہی نے دلائی تھی تاہم اس کے لاشعور میں کہیں نہ کہیں یہ خواہش موجود تھی کہ میں پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنوں (اس کے ذہن میں بڑے آدمی کا کیا تصور تھا، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا)۔ اس کا اندازہ مجھے اس کے اس رویے سے ہوا جو اس نے سکول کے سلسلے میں مجھ سے روا رکھا۔ مجھے اچھی طرح یاد

ہے کہ پانچ سال کی عمر میں جب مجھے اسکول میں داخل کرایا گیا، جو یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر ایک خستہ عمارت میں اب بھی موجود ہے،تو وہ ایک سال تک خود مجھے سکول لے جانے اور واپس لانے کی ذمہ داری نبھاتا رہا۔حالاں کہ سرکاری سڑک بننے سے پہلے جندر کے پچھواڑے سے گزرنے والا یہ راستہ جو آج کل خاصا ویران ہے اور جس میں جھاڑیاں سی اُگ آئی ہیں، خاصا آبا دہوا کرتا تھا اور اس پر ہر وقت لوگوں کی آمد و رفت لگی رہتی تھی۔میرے بیشتر ہم جماعت بھی یہیں سے گزر کر سکول جاتے تھے جو عموماً میرے ہی ہم عمر تھے لیکن وہ مجھے ان کے ساتھ بھیجنے سے گریز کرتا۔سال بعد جب میری پکی جماعت میں ترقی ہوئی تو بابا جمال دین ہی کے کہنے پر اس نے مجھے وہاں سے گزرنے والے دوسرے بچوں کے ساتھ سکول بھیجنا شروع کیا۔شروع شروع میں وہ میرا یونیفارم اور بستہ ایک تھیلے میں بند کر کے رکھتا تا کہ وہ آٹے کی دھول سے محفوظ رہیں۔پھر اس نے جندر کے کمرے کے ساتھ ایک چھپار بھی ڈال دیا جس کا مصرف صرف میرا یونیفارم اور بستہ لٹکانا تھا۔

میں صبح سویرے اٹھتا، جندر کے پچھواڑے جا کر کٹھے میں ہاتھ منہ دھوتا؛ واپس آ کر ناشتہ کرتا اور سکول چلا جاتا۔واپس آتا تو میرا باپ کھانا تیار کر رہا ہوتا،میری یادداشت میں کوئی بھی ایسا دن محفوظ نہیں،جس میں اس نے میری واپسی سے پہلے کھانا کھایا ہو۔ہم ہمیشہ اکٹھے کھانا کھاتے۔میں کھانا کھا کر،ندی کے کنارے گھروندوں سے کھیلتا رہتا یا پھر جندر کے صحن میں موجود کاہو کے ڈالے سے بندھی پینگ میں ہلارے لیتا رہتا۔کبھی کبھار میں ندی کے کنارے چلتا چلتا اس بند تک چلا جاتا جہاں سے پانی موڑ کر ایک کٹھے کی صورت جندر کے کمرے تک لایا گیا ہے۔

سکول کا کام میں ہمیشہ،شام کے وقت، جندر کی کھائی کے کنارے بیٹھ کر کرتا۔پہلی دفعہ میں نے وہاں بیٹھ کر پڑھنا کب شروع کیا،میرے حافظے کے شکستہ آئنے میں اس کا کوئی عکس محفوظ نہیں؛ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ کسی دوسری جگہ بیٹھ کر پڑھنے سے پڑھائی میں میرا دل نہیں لگتا تھا یہاں تک کہ سکول میں بھی نہیں۔اگر چونگ نہ ہونے یا کسی اور وجہ سے پاٹ رکے ہوتے تو

مجھے اپنا دماغ گھومتا ہوا محسوس ہوتا اور سبق یاد کرنے میں دشواری ہوتی۔ یہ بات میں نے کبھی اپنے باپ کو نہیں بتائی؛ اور بتاتا بھی تو شاید وہ اس پر زیادہ توجہ نہ دیتا اور سرسری گزر جاتا۔ ویسے بھی میں کیا کرتا ہوں کیا سوچتا ہوں، اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ بس وہ مجھے ہر حال میں خوش خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں اس سے کہہ دیتا کہ میرا اسکول جانے کو جی نہیں چاہتا تو وہ اپنی لاشعوری خواہش کے برعکس، محض میری خوشی کا خیال رکھتے ہوئے مجھے سکول سے ہٹا دیتا۔

جب میری ماں مری تو وہ بالکل جوان تھا لیکن اس نے دوسری شادی نہیں کی اس کی ایک وجہ وہ وعدہ بھی ہوسکتا ہے، جو اس نے اپنے آپ سے کیا تھا مگر میں جانتا ہوں کہ اس کے شادی نہ کرنے کی ایک اہم وجہ میں بھی تھا کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی دوسری بیوی میرے ساتھ سوتیلی ماؤں والا سلوک کرے۔ حالاں کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر سوتیلی ماں اپنے سوتیلے بچوں سے سوتیلی ماؤں والا ہی سلوک کرے لیکن اس کے دل میں ڈر بیٹھ گیا تھا: ویسا ہی ڈر جیسا میری ماں کے دل میں اس وقت بیٹھا تھا جب میری دادی میرے باپ کی دوسری شادی کرانے پر اصرار کر رہی تھی۔

اگر چہ جب تک وہ زندہ رہا میں اس کے ساتھ رہا لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں اس کی تنہائی بانٹنے میں ناکام رہا۔ وہ تنہائی جو میری ماں مرتے وقت اسے سونپ گئی تھی۔ اس نے میری ماں کی سونپی ہوئی تنہائی کو ہمیشہ سینے سے لگا کر رکھا اور اس میں کسی کو بھی مخل نہیں ہونے دیا؛ یہاں تک کہ مجھے بھی نہیں؛ جسے وہ بہت عزیز رکھتا تھا۔ میں آج تک اس بات کا فیصلہ نہیں کر پایا کہ وہ مجھے زیادہ عزیز رکھتا تھا یا میری ماں کی سونپی ہوئی تنہائی کو۔ شاید اس نے ان دونوں کے درمیان کوئی نامعلوم توازن دریافت کر کے ایک لکیر کھینچ لی تھی۔ اس لکیر کے ایک طرف میں تھا اور دوسری طرف وہ تنہائی جو اسے اس کی بیوی یعنی میری ماں نے سونپی تھی۔

وہ لوگوں سے بہت کم بات چیت کیا کرتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم وہ شروع ہی سے ایسا تھا یا

میری ماں کے مرنے کے بعد اسے چپ سی لگ گئی تھی؛ بہر حال میں نے جب سے ہوش سنبھالا اسے ایسا ہی پایا تھا۔ اناج لے کر آنے والوں سے وہ چند رٹے رٹائے جملے ہی بولتا تھا مثلاً؛ گھر میں سب خیریت ہے ناں؛ آج کل چوگوں کا رش ہے ترسوں آنا؛ یا چوگ یہاں نہ اتارو، اندر فلاں رنگ کی چوگ کے اوپر رکھ دو وغیرہ وغیرہ؛ اور دوسرے لوگ بھی اس سے زیادہ بات چیت نہیں کرتے تھے شاید سال ہا سال کے تعلق کی وجہ سے وہ اس کی کم گوئی سے واقف ہو چکے تھے۔ البتہ وہ مجھ سے پوری توجہ سے بات کرتا تھا۔ راتوں کو وہ زیادہ تر مجھے وہ قصے کہانیاں سناتا تھا جو اس نے بابا جمال دین سے سن رکھے تھے تاکہ میرا دل لگا رہے۔ اس وقت تو مجھے اتنی سمجھ نہیں تھی لیکن اب جب میں ان واقعات پر غور کرتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں تنہائی کا وہ روگ جسے اس نے حرزِ جاں بنالیا تھا میری بھی روح میں سرایت نہ کر جائے۔ قصے کہانیوں کے علاوہ وہ اپنی نوجوانی کے قصے بھی سنایا کرتا تھا لیکن ان قصوں میں سے اسی فی صد میں مرکزی کردار میری ماں ہی ہوتی تھی اور ہر قصے میں اس کا کردار ہمیشہ ہیروئن ہی کا تھا۔ اس نے ان قصوں کے ذریعے مجھے میری ماں کے بارے میں اتنا کچھ بتادیا تھا کہ باوجود اس کے کہ وہ میرے پیدا ہوتے ہی مرگئی تھی، مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں نے اس کے ساتھ کئی جنم گزار رکھے ہوں۔ یہ قصے رفتہ رفتہ میرے خوابوں کا حصہ بنتے گئے۔ میں نے کئی بار اپنی ماں کو خواب میں دیکھا؛ وہ ہو بہو ویسی ہی تھی جیسی میرے باپ نے اپنے نوجوانی کے قصوں میں مجھے دکھائی تھی۔ ابھی کچھ دن پہلے میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ میرا انتظار کر رہی ہے۔

جیسا کہ میں نے بتایا کہ میرا باپ تنہائی پسند ہونے کے باوجود مجھے پوری توجہ دیتا تھا لیکن ایک بات جو بہت دیر بعد، جب اس کی ہڈیاں بھی گل سڑ چکی ہوں گی، میری سمجھ میں آئی کہ اس نے مجھے کبھی اس تنہائی میں شریک نہیں کیا جو اسے میری ماں نے سونپی تھی۔ وہ اسے تنہا ہی جھیلتا رہا، مجھ پر اس کا سایہ تک نہیں پڑنے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ میرے ساتھ بظاہر خوش خوش رہنے والا اندر سے جنگلی انار کے پرانے درخت کی طرح کھوکھلا ہو چکا تھا لیکن آخری وقت تک نہ صرف

اپنی جڑوں پر قائم رہا بل کہ پھل بھی بدستور دیتا رہا۔

مجھے اب بھی یاد ہے کہ اس منحوس دن سے ایک رات پہلے، جب میں نے سکول سے واپسی پر اسے جندر کی کھائی میں مردہ حالت میں پایا تھا؛ وہ ساری رات نہیں سو سکا تھا۔ میری ماں کے برعکس، شاید، میری طرح اسے بھی اپنی موت کا پہلے ہی پتہ چل گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس رات؛ میں نے نیم خوابی کی حالت میں اس کی انگلیوں کا لمس کئی بار اپنے بالوں میں محسوس کیا تھا اور اس کے بوسے کا لمس میں اب بھی؛ اس لمحے بھی، اپنے ماتھے پر محسوس کر رہا ہوں؛ اور اس کی آنکھ سے گرا ہوا آنسو تو، ترپن چون سال گزر جانے کے باوجود، اب بھی میرے گال کو جھلسا رہا ہے۔ مجھے اب بھی یوں محسوس ہو رہا ہے کہ میرے گال پر جہاں اس کا آنسو گرا تھا، ایک چھالا سا بنا ہوا ہے۔ میں ساری زندگی اس چھالے کو پھوڑنے کی کوشش کرتا رہا لیکن ناکام رہا اور اب جب کہ میں جندر کی کھائی کے تھلے پر لیٹا دھیرے دھیرے موت کی کھائی میں اتر رہا ہوں، اس کی جلن بدستور محسوس کر رہا ہوں اور لگتا ہے یہ جلن میری موت کے بعد جسم سے نکل کر میری روح میں اتر جائے گی اور امر ہو جائے گی؛ امرِ ربی کی طرح۔ مرنے کے بعد اگر میں جنت میں گیا تو بھی یقیناً اسے ساتھ ہی لے کر جاؤں گا۔

اس روز جب میں سویرے اٹھا تو مجھے یہ تمام واقعات خواب جیسے لگے؛ ان کی حقیقت تو مجھ پر اس وقت کھلی جب میں سکول سے واپس آیا اور اسے مردہ حالت میں پایا۔

اُس صبح میں کھیتوں میں حاجاتِ ضروریہ سے فارغ ہونے اور کھٹے پر ہاتھ منہ دھونے کے بعد واپس آیا تو میرا باپ حسبِ معمول میرا ناشتہ تیار کر چکا تھا۔ جب وہ میرے ساتھ ناشتہ کرنے بیٹھا تو مجھے محسوس ہوا کہ اسے بالکل بھوک نہیں ہے اور وہ زبردستی کھا رہا ہے۔ نوالہ نگلنے میں اسے خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن وہ ناشتہ کرنے کی اداکاری کرتا رہا اس خوف سے کہ اگر اس نے ہاتھ کھینچ لیا تو کہیں میں بھی بغیر سیر ہوئے اسکول نہ چلا جاؤں۔ میں نے بستہ اٹھاتے ہوئے ایک نظر اُس کے چہرے پر ڈالی تو وہ مجھے کچھ بدلا بدلا سا لگا۔ لیکن سترہ اٹھارہ سال

کا ایک ایسا لڑکا جس نے ساری زندگی ندی کنارے ایک جندر میں گزاری ہو، اس بات کا اندازہ کیسے کر پاتا کہ جب وہ واپس آئے گا تو یہ تنہائی کا مارا چلتا پھرتا لاشہ جندر کی کھائی میں بے حس و حرکت اوندھا پڑا ہوگا۔

سکول سے واپسی پر جب میں جندر کے پچھواڑے سے اتر رہا تھا تو مجھے خالی گھومتے پاٹوں کی کوک سنائی دی۔ لحہ بھر کے لیے میں نے سوچا کہ ہو نہ ہو آج بابا کی آنکھ لگ گئی ہے اور وہ اگلی چونگ کھارے میں الٹا نہیں پایا تبھی جندر خالی گھوم رہا ہے۔ جب میں دروازے پر پہنچا اور کھائی میں جھانک کر دیکھا تو وہ کھائی میں اوندھا پڑا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں خالی بوری تھی ؛ دونوں کا منہ کھلا ہوا تھا ؛ بوری کا بھی اور میرے باپ کا بھی۔ اس کا نصف سے زائد چہرہ آٹے میں کھبا ہوا تھا اور آٹے پر ایک سرخ سا دھبا تھا۔ یہ یقیناً خون نہیں تھا ؛ تنہائی تھی، جو اس نے جاتے جاتے اگل دی تھی شاید اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ مرتے ہی اپنی بیوی سے جا ملے گا لہٰذا اب اسے ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے جب اسے سیدھا کیا تو میری سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ میں کافی دیر وہیں کھائی کے کنارے سے ٹیک لگائے، اس کے چہرے پر نظر جمائے کھڑا ،جندر کی کُوک سنتا رہا ؛ جو آہستہ آہستہ ہُوک میں بدل رہی تھی۔ تب سے یہ مجھے جندر کے بجائے اپنے وجود کی گہرائیوں سے اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے ؛ جیسے اب محسوس ہو رہی ہے۔ جب خالی گھومتے پاٹوں کی رگڑ سے پیدا ہونے والی بو سے میرا دم گھٹنے لگا تو مجھے جندر بار نے کا خیال آیا۔

میں بھاگتا ہوا جندر کے پچھواڑے گیا اور کھٹے کے کنارے لگے ہوئے لکڑی کے پشتے کو کھینچ کر باہر نکالا اور اسے کھٹے کے آگے لکڑی کے پرنالے میں نصب کر دیا۔ اگلے ہی لمحے گُوکتا جندر خاموش ہو گیا۔ واپس آ کر میں نے اس کی لاش اٹھا کر کھائی سے باہر نکالی اور اسے اس چارپائی پر ڈال دیا جس پر وہ سویا کرتا تھا۔ جب میں نے اس کے منہ پر چادر ڈالی تو مجھے لگا جیسے وہ مرا نہیں، سو رہا ہے اور یہ شک اس وقت تک قائم رہا جب تک میں اس کے منہ پر سے چادر اٹھا کر اس کی کھلی آنکھوں میں نہ جھانک چکا۔ میں نے جب غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو وہاں

سے تنہائی غائب تھی؛ میری ماں کی سونپی ہوئی تنہائی ۔اور پھر اگلے ہی لمحے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مر چکا ہے۔لیکن اس کے باوجود میں بالکل نہیں رویا۔حالاں کہ میں نے اس سلسلے میں شعوری طور پر کسی قسم کے ضبط سے کام بھی نہیں لیا تھا۔ میں جلدی جلدی اٹھا دروازہ بند کیا اور اپنے چچا کو بتانے گاؤں چلا گیا۔چچا نے اپنے بھائی کی موت کا سن کر جب مجھے گلے لگایا تو تب میری آنکھوں سے پہلا آنسو امڈا اور جب وہ اس نادیدہ چھالے سے ٹکرایا، جو گزشتہ رات میرے باپ کی آنکھ سے گرنے والے آنسو سے میرے گال پر بنا تھا،تو میں نے اس کی جلن روح کی گہرائیوں تک محسوس کی اور میں دھاڑیں مار کر رونے لگا۔

چالیسویں تک میں چچا کے گھر پر ہی رہا۔لیکن اس دوران میں، میں کسی رات بھی گہری نیند نہیں سو سکا۔ جوں ہی میری آنکھ لگتی، باپ کا مردہ چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتا اور میری آنکھ کھل جاتی ۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ سکول چھوڑ کر جندر ہی سنبھالوں گا۔اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا آخر مرنے والے کے ساتھ مرا بھی تو نہیں جاتا ، زندگی کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ چچا کے معاشی حالات تو میرے باپ سے بھی گئے گزرے تھے اور اوپر سے اس کے اپنے سات بچے تھے وہ ایک اور کا بوجھ کیوں کر اٹھا پاتا ۔ جب تک ،میرا باپ زندہ رہا، جندر کی آمدنی میں سے اس کا حصہ اسے بھجواتا رہا۔اب کچھ نہ کچھ فریضہ تو مجھے بھی ادا کرنا تھا۔ میں نے اپنا یہ فیصلہ جب بابا جمال دین اور چچا کو سنایا تو ان دونوں نے بھی میری حوصلہ افزائی کی ۔کچھ دن چچا بھی میرے ساتھ جندر پر رہا۔اس خیال سے کہ کہیں میں رات کو ڈر نہ جاؤں۔لیکن جب اس نے اپنے طور پر یقین کر لیا کہ میں مضبوط دل کا مالک ہوں تو وہ واپس جا کر اپنے کام دھندے میں مشغول ہو گیا کہ سات بچوں کو محض جندر چلا کر پالنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔تاہم بابا جمال دین اسی کے پیٹے میں ہونے کے باوجود ہر روز صبح سویرے جندر پر آجاتا اور دوپہر تک میرے ساتھ رہتا، مجھ سے گپ شپ کرتا، کہانیاں سناتا اور باپ کا غم غلط کرنے میں میری مدد کرتا۔

جتنے دن چچا میرے ساتھ جندر پر موجود رہا، رات کی ڈیوٹی وہ خود کرتا رہا اور میں آرام سے سویا رہتا۔لیکن جس روز وہ اپنے گھر گیا، میں سرِ شام ہی جندر بار کر سونے کی کوشش کرنے لگا

لیکن مجھے ساری رات نیند نہیں آئی ۔ وہ رات مجھ پر بہت بھاری تھی ۔ میں جیسے ہی آنکھیں بند کرتا مجھے باپ کی لاش، کھائی میں اوندھی پڑی، دکھائی دیتی اور میں دوبارہ آنکھیں کھول دیتا۔ اگر کبھی آنکھ لگ جاتی تو ڈراؤ نے خواب آتے۔ فجر کے وقت میں نے اٹھ کر جیسے ہی پانی موڑ کر چرخا گھمایا اور کھارے میں چونگ انڈیلی مجھے نیند نے آلیا۔ صبح بابا جمال دین کے دروازہ کھٹکھٹانے پر جب میری آنکھ کھلی تو جندر رکوک رہا تھا اور اس کا کھارا دانوں سے خالی ہو چکا تھا۔

دن تو خیر بابا جمال دین کے ساتھ گپ شپ اور کہانیاں سننے میں گزر ہی جاتا لیکن رات بہت بھاری ہوتی تھی ۔ اگلی رات بھی میرے ساتھ وہی ہوا۔ شام سے رات کے پچھلے پہر تک بستر پر لیٹا کروٹیں بدلتا رہا، آخر تنگ آکر میں نے ایک بڑی چونگ کھارے میں انڈیلی اور پانی موڑنے جندر کے پچھواڑے چلا گیا۔ جوں ہی میں نے جندر کے پتھریلے کھارے کو پاٹ سے ملانے والی نالی کے ساتھ لگی لکڑی کی کیل گھومتے پاٹ پر رکھی اور اس کی تھرتھراہٹ سے دانے پاٹ کے سوراخ میں گرنے لگے، مجھے نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ دانے ختم ہوتے ہی جب جندر کی آواز تبدیل ہوئی تو میری آنکھ کھل گئی۔

یہ سلسلہ اگلی کئی راتوں تک چلتا رہا۔ میں جندر کی کھائی کے کنارے بیٹھا اونگھ رہا ہوتا اور جیسے ہی پانی موڑ کر سونے کی کوشش کرتا میری نیند اُڑ جاتی۔ میری سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں ۔ ہاں یہ بات میرے ذہن میں بیٹھ گئی تھی کہ نیند نہ آنے کی وجہ تنہائی کا خوف ہوسکتا ہے۔ چناں چہ میں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ سرِ شام ہی جندر بار کر چچا کے گھر چلا جایا کروں گا تا کہ رات کو آرام سے سوسکوں اور روز تازہ دم ہو کر خوب محنت کروں۔ چچا کے گھر گزرنے والی تین چار راتوں میں ہی میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ نیند نہ آنے کی وجہ خوف نہیں جندر کی سریلی گونج ہے۔ سو اس کے بعد میں نے اپنا معمول بنا لیا کہ جیسے ہی مجھے اونگھ آنا شروع ہوتی؛ میں اُٹھ کر ایک بڑی چونگ کھارے میں انڈیلتا؛ کمرے کے پچھواڑے جا کر آدھا پانی موڑ کر دوسرے کٹھے میں ڈالتا تا کہ پاٹ کی رفتار کم سے کم ہو اور وہ آٹا پیسنے میں زیادہ سے زیادہ وقت لگائے اور میں دیر تک نیند

کے مزے لے سکوں۔ مجھے رات کو صرف ایک بار ہی اٹھنا پڑتا اور میں کوئی دوسری چونگ کھارے میں انڈیل کر دوبارہ سو جاتا۔

نیند کا مسئلہ حل ہوتے ہی ایک اور مسئلے نے سر اٹھالیا؛ وہ یہ کہ جس دن بابا جمال دین نہ آتا اور میں کھائی کنارے تنہا بیٹھا ہوتا مجھے ایک نامعلوم سی بے چینی آگھیرتی۔ کیوں کہ ان دنوں، میں غوروفکر کرنے کا عادی نہ تھا لیکن میں اس بے چینی کی بابت کئی دن تک سوچتا رہا؛ بل کہ میں سمجھتا ہوں کہ چیزوں کے بارے میں سوچنے اور انھیں سمجھنے کی عادت مجھے وہیں سے پڑی؛ حالاں کہ غوروفکر کے اپنے اس پہلے تجربے میں، میں کسی نتیجے پر پہنچنے میں ناکام رہا تھا۔ کئی دن تک مسلسل غوروفکر کرنے کے باوجود میں اس بے چینی کی وجوہات تلاش نہیں کرسکا؛ تاہم میں نے اپنے تجربے کی بنیاد پر یہ نتیجہ ضرور اخذ کرلیا تھا کہ بے چینی صرف کھائی کے جنوبی تھلے پر بیٹھنے سے ہوتی ہے، باقی جگہوں پر میں پُرسکون بیٹھ سکتا ہوں۔ اس بے چینی سے تنگ آکر میں نے سیر سپاٹے کا مشغلہ اپنالیا۔

اپنے مہینے بھر کے مشاہدے سے میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ ایک من گندم؛ دو سوا دو گھنٹوں میں جب کہ اتنی ہی مکئی؛ اڑھائی سے تین گھنٹوں میں پِس جاتی ہے۔ میں چونگ کھارے میں انڈیلتا؛ پسی ہوئی چونگ کا آٹا بوری میں ڈالتا اور باہر نکل جاتا اور اڑھائی تین گھنٹے تک ندی کے کنارے گھومتا رہتا۔ اگرچہ تین سال کی عمر کے بعد میری ساری پرورش، پہاڑوں کا سینہ چیر کر اپنا رستہ بناتی، اسی ندی میں ہوئی تھی لیکن اس سے پہلے اس کی پراسراریت کبھی مجھ پر منکشف نہیں ہوئی تھی۔ جب میں نے اس کے کنارے گھومنے پھرنے کا مشغلہ اپنایا تو اس نے آہستہ آہستہ مجھ پر اپنے اسرار کھولنا شروع کیے۔ میں نے ایک ہی موسم کے مختلف اوقات میں اس کے کئی رنگ اور کئی روپ دیکھے۔ صبح کے وقت اس کے بہاؤ میں ایک مانوسیت سی ہوتی اور مجھے اس کی گود میں سکون ملتا، ویسا ہی سکون جیسا کسی بچے کو ممتا بھری ماں کی بانہوں میں ملتا ہے۔ لیکن جوں ہی دوپہر کا وقت ہوتا اور میرا سایہ میرے قدموں سے لپٹتا؛ یک دم اس میں ایک پراسراریت سی در آتی اور ایک عجیب اور ناقابلِ توضیح سا خوف میری رگ و پے میں دوڑنے لگتا اور خاموشی کی چاپ کانوں

میں گونجنے لگتی۔لہریں، چٹانیں ، درخت ،گھاس ،کائی ،مچھلیاں، پرندے ،حتیٰ کہ پھول تک اجنبیت کا لبادہ اوڑھ لیتے اور اس کے بہاؤ پر تیرتے درختوں کے سائے ، مجھے چلتے پھرتے ہیولےمعلوم ہونے لگتے ۔ندی کے کنارے کنارے چلنے والا رستہ،بل کھاتے اژدھے کے مانند دکھائی دینے لگتا۔ پھرعصر کے وقت جوں ہی سورج کوہ مل کی چوٹی کی طرف جھکتا، یک دم منظر تبدیل ہونے لگتا اور تمام چیزیں دوبارہ مانوس ہوکر مجھ سے ہم کلام ہونے لگتیں۔ یہ ہم کلامی اس وقت تک جاری رہتی جب تک انھیں سیلن زدہ اندھیرا اپنی لپیٹ میں لے کر گم نہ کر دیتا۔

ایک جندروئی کے لیے ؛رات سب سے محفوظ پناہ گاہ ثابت ہوتی ہے۔جوں جوں چیزیں اپنا وجود اندھیرے میں گم کرتی جاتی ہیں،ان سے چمٹا نامعلوم خوف بھی آہستہ آہستہ ان سے علاحدہ ہوتا جاتا ہے اوراس کی جگہ ایک طلسم لے لیتا ہے۔ندی کے بہاؤ پر ٹھہری رات کے طلسم سے صرف ایک جندروئی ہی آشنا ہوسکتا ہے۔ رات کے وقت جندروئی کسی سے نہیں ڈرتا سوائے اپنی ذات کے ۔اندھیرے کی چادر تنتے ہی جب چیزیں اس کی نظروں سے اوجھل ہونا شروع ہوتی ہیں،اس پر اپنی ذات کے اسرار کھلنا شروع ہو جاتے ہیں، جواس کے گرد حیرت کا ایک ہالہ سا تان دیتے ہیں ۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ہالہ اتنا طاقت ور ہوتا جاتا ہے کہ بسا اوقات وہ دن کے وقت بھی بہ مشکل ہی اس سے باہر آپاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر جندروئی دن کے وقت بھی،میرے باپ کی طرح ، اپنے آپ ہی میں گم رہتے ہیں ۔جندر پر چھائی ہوئی رات کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے ہمیشہ یہ خیال آتا ہے کہ گوتم بدھ اگر نروان حاصل کرنے کے لیے برگد کے سائے کے بجائے کسی جندر کا انتخاب کرتا تو بہت کم وقت میں اپنی منزل پالیتا کہ میرے نزدیک ارتکاز توجہ کے لیے،اس اسرار بھری کائنات میں،گھومتے جندر کی سریلی گونج سے بہتر کوئی چیز نہیں ۔اگر انھی دنوں مجھے مچھلی کے شکار کا شوق نہ چراتا اور میں مچھلی پکڑنے کے اپنے اُس پہلے تجربے میں ناکام نہ ہوتا تو شاید میں کائنات کے اس اہم راز سے کبھی آشنا نہ ہوسکتا۔

میرے باپ کی موت کے کوئی مہینہ بھر بعد کی بات ہے کہ ایک دن، میں یوں ہی اکتایا

ہوا ندی کنارے بیٹھا پانی میں تیرتی مچھلیوں کو غور سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک مجھے خیال آیا کہ بے کار بیٹھنے کے بجائے کیوں نہ مچھلیوں کا شکار کیا جائے۔ چناں چہ اگلے ہی روز میں نے قریبی قصبے میں جا کر، اس مقصد کے لیے ضروری ساز و سامان خریدا اور اپنے جندر سے کوئی دو سو گز کے فاصلے پر موجود، ایک ایسی جگہ جہاں زمین میں ایک گہرا کھڈا سا بنا ہوا تھا اور پانی اس میں گر کر اپنی سطح ہموار کر لیتا تھا، بیٹھ گیا؛ پہلے دن تو اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے میں کوئی مچھلی نہ پکڑ سکا لیکن دوسرے روز جب پہلی مچھلی میرے پھینکے ہوئے کانٹے سے الجھی اور میں نے اسے پانی سے باہر ریت پر پٹخا تو اسی لمحے میں نے آئندہ کے لیے اس کام سے توبہ کر لی۔ مچھلی جو یقیناً میری طرح ناتجربہ کار تھی کسی طرح میرے دام میں تو آ گئی لیکن اپنی ناتجربہ کاری کے باعث؛ میں نے اسے پوری طرح کانٹا نگلنے نہیں دیا اور اسے باہر پٹخ دیا ابھی کانٹا ہوا ہی میں تھا کہ وہ اس سے جان چھڑا کر ریت پر جا گری اور دیر تک وہاں تڑپتی رہی۔ مجھ سے اس کا تڑپنا دیکھا نہ گیا میں نے اسے دوبارہ پانی میں ڈالنے کی کوشش کی لیکن وہ میرے ہاتھ نہ آئی اور وہیں تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ میں دیر تک مری ہوئی مچھلی کے پاس بیٹھا افسوس کرتا رہا اور پھر کانٹا، ڈور اور طعمہ وہیں پھینک کر واپس آ کر اسی جندر کے اسی تھلے پر آ کر بیٹھ گیا جو میرے اندر بےچینی کی آگ سلگا دیتا تھا۔

اس واقعے کے بعد کے دنوں میں سے کسی دن کا ذکر ہے ________ یہ میں اس لیے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ جو واقعہ میں بیان کر رہا ہوں وہ اسی تڑپتی ہوئی مچھلی کے التباس کے سبب رونما ہوا تھا ________ میں حسب معمول اکتایا ہوا کھائی کے کنارے بےچین بیٹھا ہوا تھا کہ میری آنکھوں کے آگے اسی تڑپتی ہوئی مچھلی کا وجود لہرایا۔ یہ منظر اتنا واضح تھا کہ مجھے سامنے کی دیوار پر ندی کے راس کا گمان ہوا اور میں لاشعوری طور پر اسے پکڑ کر پانی میں پھینکنے کے لیے لپکا جس کے نتیجے میں، میں سامنے کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ میرا ماتھا پتھریلی دیوار سے لگنے کے بجائے اس لبتے سے جا لگا، جسے میں نے اپنے باپ کی وفات والے دن چارپائی پر پھینکا اور بعد میں جب میں نے اس کی لاش کھائی سے نکال کر چارپائی پر ڈالی تھی تو اسے پیار میں

جا کرٹانگنے کے بجائے وہیں دیوار کے ساتھ لگی میخ کے ساتھ لٹکا دیا تھا۔ میرا ماتھا بستے سے ٹکراتے ہی میخ اکھڑ گئی اور بستہ میرے قدموں میں آ گرا اور آٹے کی دھول کی ایک بوچھاڑ مجھے کپڑوں سمیت نہلا گئی۔ میں نے سنبھلتے ہی بستہ اٹھایا اسے جھاڑ کر ایک طرف رکھا اور کپڑوں سمیت ندی میں غوطہ لگانے چلا گیا۔ واپس آ کر کپڑے بدلے اور مختلف کتابیں دیکھنے لگا۔ جوں ہی دسویں جماعت کی اردو کی کتاب ہاتھ لگی میں نے اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ کتاب میں موجود ایک کہانی نے، جو ابھی سکول میں پڑھنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی، کہ مجھے اسکول چھوڑنا پڑا تھا، میری توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ جوں ہی میں نے ایک صفحہ ختم کیا اور جندر کے پاٹوں کے آگے جمع ہونے والے آٹے پر ایک نظر ڈالنے کے لیے رکا، مجھے محسوس ہوا کہ میری بے چینی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے؛ اور پھر کہانی ختم ہونے تک میں نے وہ راز پا لیا جس کے پانے کی جستجو میں، میں پہلے کئی دن غور و فکر کرتا رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں ہمیشہ یہیں بیٹھ کر اپنا سکول کا کام کیا کرتا تھا اور اب جو بے چینی میں یہاں بیٹھ کر محسوس کرتا ہوں اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ جب سے میرا باپ مرا میں یہاں ہمیشہ کتاب کے بغیر بیٹھتا رہا ہوں۔ نصاب کی وہ مختصر کتاب میں نے اسی دن ختم کر لی۔ باقی کتابیں پڑھنے کی کوشش کی لیکن ان میں میرا دل نہیں لگا۔

اگلے ہی دن میں نے بابا جمال دین کو جندر پر بٹھایا اور علاقے کے مرکزی بازار چلا گیا اور وہاں سے کہانیوں کی کچھ کتابیں خرید لایا؛ تب سے میری کتابوں سے دوستی ہے۔ لیکن مطالعہ میں نے ہمیشہ اسی تھلے پر بیٹھ کر اور جندر چلا کر کیا کہ ان دونوں لوازمات کے بغیر میرا پڑھنے میں جی ہی نہیں لگتا تھا۔ جوں ہی دانے ختم ہوتے اور جندر کی سریلی گونج کوک میں بدلتی میری توجہ منتشر ہو جاتی۔

میں ہمیشہ اس الجھن کا شکار رہا ہوں کہ جندر کی گونج سنے بغیر لوگ مطالعہ کیسے کر لیتے ہیں۔ کم از کم میں تو اس سریلی گونج کے بغیر دو چیزوں کا تصور تک نہیں کر سکتا؛ ایک مطالعے کا اور دوسرا نیند کا۔ میں جب کبھی شہر گیا اور لوگوں کو کہیں بیٹھے کتابیں پڑھتے پایا تو مجھے بہت عجیب لگا کہ یہ لوگ جندر کی سریلی گونج کو روح میں اتارے بغیر اپنی توجہ کس طرح کتاب پر مرتکز کر لیتے ہیں۔

۱۱

آٹا پسائی ان دنوں بھی چار سیر فی من ہی تھی جو تین چار افراد کا کنبہ پالنے کو کافی تھی۔ لیکن جندر وراثتی ہونے کی وجہ سے اس میں میرے دو چچاؤں کا بھی حصہ تھا، چوں کہ وہ خود جندر پر نہیں بیٹھتے تھے اس لیے علاقے کے طے شدہ ضوابط کے مطابق حاصل شدہ آمدنی کا نصف میرا اور باقی نصف ان دونوں کا بنتا تھا۔ ان دنوں ابھی میری شادی بھی نہیں ہوئی اور بہن بھائی میرا کوئی تھا نہیں لہٰذا آمدنی کا نصف حصہ انھیں ادا کرنے کے بعد بھی میرا ٹھیک ٹھاک گزارہ چل رہا تھا۔ میں اپنے ذاتی اخراجات نکال کر باقی پیسوں کی کتابیں خرید لاتا اور فارغ اوقات میں ان کے مطالعے میں غرق رہتا۔ شروع شروع میں، تو میں انھیں پڑھنے کے بعد تھیلوں میں ڈال کر دیوار سے لٹکا دیتا تا کہ وہ آٹے سے اٹھنے والی دھول سے محفوظ رہیں لیکن جب ان کی تعداد خاصی بڑھ گئی اور انھیں سنبھالنا مشکل ہو گیا تو مجھے علاحدہ سے ایک کمرہ تعمیر کرنے کا خیال آیا۔ جندر کے ساتھ پسار تو پہلے ہی بنا ہوا تھا سوچا اسی کے تینوں اطراف دیواریں اسار کرا سے ایک باقاعدہ کمرہ بنالوں تا کہ کتابیں ہر طرح سے محفوظ رہیں۔

اسی منصوبے کو ذہن میں رکھ کر ایک دن میں نے جندر بارا اور کوہل کے دامن میں واقع اس چھوٹے سے گاؤں کی راہ لی جس میں بابا جان محمد رہتا تھا۔ اس کا تعلق تو مستریوں کے گھرانے سے تھا لیکن وہ علاقے میں جندر کے کل پرزوں کا بھی ماہر سمجھا جاتا تھا اور میرا باپ جندر کے تمام کل پرزوں کا کام اسی سے کرواتا تھا۔ میں نے جب اسے بتایا کہ میں جندر کے ساتھ ایک کمرہ

تعمیر کرنے کا خواہش مند ہوں اور سر دست میں اس کے اخراجات کا تخمینہ لگوانا چاہتا ہوں تا کہ مطلوبہ رقم کی فراہمی کے بعد اس سلسلے میں آپ کی خدمات حاصل کر سکوں تو بابا جان محمد کہنے لگا کہ میں صرف اور صرف جندر کے کل پرزوں ہی کا کام کرتا ہوں اور دیواریں اسارنے کا کام میں نے ایک عرصہ ہوا چھوڑ رکھا ہے۔ لیکن تمھارا باپ چوں کہ میرا دوست تھا اس لیے میں اپنے بیٹے فضل کو تمھارے ساتھ بھیجتا ہوں تا کہ وہ جگہ کی پیمائش کر کے لے آئے اور میں تجھے اس کا تخمینہ لگا دوں گا۔

اگلے دن جب اس کا تخمینہ آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کے لیے ایک اچھی خاصی رقم درکار ہے۔ میں یہ رقم جمع کرنے کی منصوبہ بندی کر ہی رہا تھا کہ ہمارے علاقے کو اپنے دور کی بدترین خشک سالی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

ندی جوڑیاں، جس میں اس وقت میرا یہ جندر کوک رہا ہے، کوہ مل کی بہت سی آبشاروں، چشموں اور رملا چھا می ایک چھوٹی ندی سے مل کر اپنی جولانی ترتیب دیتی ہے۔ ملا چھ میرے جندر سے قریباً ڈیڑھ میل پیچھے جوڑیاں سے آ کر ملتی ہے۔ ان چشموں میں سے بیشتر جھاڑے اور گرمی کے دنوں میں سوکھ جاتے ہیں، جس کی وجہ سے جوڑیاں میں پانی خاصا کم ہو جاتا ہے، تاہم خشک سالی کے دنوں میں بھی اس میں اتنا پانی ضرور موجود رہتا ہے کہ وہ یہاں موجود جندروں کے بھاری پاٹوں کو دھکیل سکے۔ لیکن بدترین خشک سالی والے اس سال، کئی ماہ تک بارشیں نہ ہونے کی وجہ سے وہ تمام جندر جو یہاں سے ندی کے بہاؤ کی الٹی جانب واقع ہوتے تھے ____ اور جو ،اب مدت سے کھنڈروں میں تبدیل ہو چکے ہیں ____ پانی نہ ہونے کی وجہ سے مکمل طور پر بند ہو گئے تھے، تاہم ملا چھا اور جوڑیاں کے ملاپ سے میرے جندر والے مقام پر ندی میں اتنا پانی اس بدترین خشک سالی کے دنوں میں بھی ضرور بہتا رہا تھا کہ جندر گھنٹے بھر میں بارہ چودہ سیر دانے پیس ہی ڈالتا تھا۔

اس سال باقی جندر بند ہو جانے کی وجہ سے میرے جندر پر چونگوں کا رش بڑھ گیا تھا کہ کوہ مل اور کوہ رمیال کے اردگرد واقع دیہات کے لوگ، جو پہلے اپنے قریبی جندروں سے اناج پسوایا کرتے تھے، انھیں بھی اناج پسوانے مجبوراً میرے پاس ہی آنا پڑ رہا تھا۔ ان دور دراز کے دیہاتوں سے آنے والے لوگوں کی کوشش ہوتی کہ وہ اسی دن اپنے دانے پسوا کر لے جائیں

تا کہ انھیں اتنی دور سے دوبارہ نہ آنا پڑے۔ ہر آنے والا مجھ سے درخواست یا تقاضا کرتا کہ میں اسے ابھی اور اسی وقت پیس دوں، اور جب میں اسے اپنی باری کا انتظار کرنے کو کہتا تو وہ مجھے پانچ سیر فی من پسوائی کی پیش کش کر دیتا۔ پہلے تو کئی دن تک میں ان لوگوں کی ان پیش کشوں کو رد کرتا رہا لیکن ایک روز جب میں جندر میں لیٹا، پیار کو کمرے میں تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا تو مجھے خیال آیا کہ اگر میں ان دور سے آنے والوں کی پیش کشیں قبول کر لوں تو خشک سالی کے اختتام تک اتنے پیسے ضرور جمع کر لوں گا کہ اپنی اس خواہش کی تکمیل کر سکوں۔ چناں چہ زیادہ منافع کے پیش نظر میں قریبی گاؤں کے لوگوں کو ہفتے ہفتے بعد کا وقت دینے لگا اور دور سے آنے والوں سے بھاؤ تاؤ کر کے انھیں چونگیں پیس کر دینے لگا۔ جوں ہی کوئی اجنبی گدھے پر لدی چونگیں لیے جندر کے صحن میں اترتا، میں سمجھ جاتا کہ وہ کسی دور دراز کے گاؤں سے آیا ہے؛ چناں چہ اس سے بھاؤ تاؤ کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو جاتا۔ جوں ہی سودا طے پاتا، میں باری پر لگی ہوئی ''چونگ'' کو پرے ہٹاتا، جتنا آٹا پس چکا ہوتا اسے ایک طرف اکٹھا کرتا اور اس آدمی کی چونگ جندر کے کھارے میں انڈیل دیتا، جس سے دانے آہستہ آہستہ جندر کے گھومتے ہوئے پاٹ کے سوراخ میں گرتے رہتے، اور کھائی میں باریک آٹے کی صورت بکھرتے رہتے۔ اگر میں سمجھتا کہ اناج زیادہ ہے اور اسے پینے میں زیادہ وقت لگے گا تو جوں ہی اناج والا دھوپ سینکنے کے لیے باہر صحن میں جاتا؛ میں چپکے سے پڑوں کو گھمانے والے چرخے کے ساتھ لگی ہوئی لکڑی کی میخ کو کھینچ کر جندر کی رفتار بڑھا دیتا اور جندر موٹا موٹا آٹا کھائی میں پھینکنا شروع کر دیتا۔ یوں جتنی دیر میں وہ پہلے ایک من دانے پیس رہا ہوتا؛ ڈیڑھ سے پونے دو من پیس کر رکھ دیتا۔ جوں ہی وہ آدمی مجھے ایک سیر فی من اضافی پسائی کے ساتھ ساتھ دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوتا میں کٹائی کے طور پر لیے ہوئے موٹے آٹے کو دوبارہ کھارے میں انڈیلتا اور لکڑی کی میخ کو نیچے کھینچ دیتا۔

جوں جوں دن گزر رہے تھے پانی کم ہو رہا تھا کچھ ہی دنوں بعد مجھے خبر ملی کہ کوہ رمیال کے دوسری جانب بہنے والی ندی نیلاں میں چلنے والے تمام جندر بھی خشک سالی کی وجہ سے بند ہو

گئے ہیں اور وہاں کے لوگ ابلے ہوئے دانوں پر گزارہ کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

بارش نہ ہونے کی وجہ سے سردی کی شدت میں بھی اضافہ ہو گیا اور سہ پہر کے بعد چلنے والی ہوا جسموں کو چھیدتے ہوئے گزرنے لگی تھی۔ لہٰذا مجبوری کے باوجود مغرب کے بعد کوئی بھی شخص ندی کی طرف رخ کرنے کی ہمت نہیں کرتا تھا اور میں سرِشام ہی باہر کے کام نپٹا کر جندر کے ایک کونے میں آگ جلا کر مطالعے میں غرق ہو جاتا؛ اور اس وقت تک غرق رہتا جب تک جندر کی سریلی کوک میں تبدیل نہ ہو جاتی۔

انھی سرد دنوں میں سے ایک دن سویرے سویرے ایک آدمی اپنا اناج لے کر آ گیا۔ چار بڑی چونگیں تھیں جنھیں، وہ دو گدھوں پر لاد کر لایا تھا۔ میں دن بھر اسی کے دانے پیستا رہا، جب اس کی آخری چونگ ختم ہوئی تو مغرب کی اذانیں ہو چکیں تھیں۔

اس کے جانے کے بعد میں نے ایک ہی چونگ پیسی۔ اتنے میں عشا کی نماز کا وقت ہو گیا۔ ان دنوں میں پابندی سے نماز ادا کیا کرتا تھا۔ میں نے ایک بڑی چونگ کھارے میں انڈیلی اور نماز پڑھنے لگا۔ نماز کے بعد میں نے جندر کے پچھواڑے جا کر پانی والا پشتہ ذرا سا اوپر کھینچا تا کہ جندر کی رفتار دھیمی ہو جائے اور ایک ہی چونگ زیادہ دیر تک پستی رہے تا کہ میں سکون سے سوتا رہوں۔ واپس آ کر میں نے جندر کی رفتار اور کھارے میں پڑے ہوئے دانوں کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ میں کم از کم پانچ گھنٹے آرام سے سو سکتا ہوں۔

ان دنوں دروازوں کے صرف باہر کی جانب کنڈیاں یا آنگلیں وغیرہ ہوا کرتی تھیں اندر کی جانب کنڈیاں لگانے کا رواج نہیں تھا بلکہ دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے لکڑی کا ایک بالا مضبوطی سے ٹکا دیا جاتا تھا۔ بستر پر لیٹنے سے پہلے میں نے حسبِ دستور دروازے کے پیچھے، بالا مضبوطی سے ٹکا دیا۔ اس کا ایک اضافی فائدہ یہ بھی تھا کہ دروازے کی درزیں مکمل طور پر بند ہو گئی تھیں اور جسموں کو چھیدنے والی سرد ہوا، جو پہلے درزوں سے اندر آ رہی تھی مکمل طور پر رک گئی تھی۔

میں نے اپنا بستر سیدھا کیا اور لیٹ گیا۔ ابھی میں اونگھ ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی، جو جندر کی گونج میں بھی واضح طور پر سنائی دی۔ لیکن میں نے یہ سوچ کر کہ اس وقت یہاں کون آ سکتا ہے، اسے سرپھری ہوا کے دروازے سے ٹکرانے کی آواز سمجھا۔ کچھ دیر بعد دستک کی آواز ایک مرتبہ پھر سنائی دی تو میرے کان کھڑے ہو گئے، میں اس آواز کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ تیسری بار دستک کی آواز سنائی دی۔

جوں ہی تیسری بار دستک کی آواز ابھری، اس خیال سے کہ گاؤں میں کوئی ان ہونی ہو گئی ہوگی اور کوئی مجھے اس کی اطلاع دینے آیا ہوگا، میں اٹھ کر دروازے کی طرف لپکا۔ دروازے کے پیچھے ٹکے ہوئے بالے کو میں اکھاڑ ہی رہا تھا کہ چوتھی بار دستک ہوئی۔ بالا ہٹا کر جوں ہی میں نے ایک پٹ کھولا سامنے ایک سفید ریش اجنبی بزرگ اپنے کاندھے پر ایک وزنی بوری لادے کھڑے تھے۔

میں نے انھیں سلام کیا اور اندر آنے کو کہا۔ وہ خاموشی سے کمرے میں داخل ہوئے، میں نے انھیں کاندھے پر سے بوری اتارنے میں مدد دی، جو بہت بھاری تھی اور اس میں کم از کم اڑھائی من اناج تھا۔ بوری اترتے ہی انھوں نے اپنا منڈھاسا، جو بوری اتارتے ہوئے ایک طرف کو کھسک گیا تھا، درست کیا اور میرے بستر پر بیٹھ گئے۔

ان کا سانس پھولا ہوا تھا اور چہرے پر تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے۔ پہلے تو وہ کافی دیر خاموش رہ کر اپنا سانس ہموار کرنے کی کوشش کرتے رہے اور پھر بتانے لگے کہ میں بہت دور سے آیا ہوں۔ خشک سالی کی وجہ سے میرے علاقے کی ندیاں بالکل خشک ہو گئی ہیں۔ میرے بچے بھوکے ہیں انھیں کئی دن سے روٹی نصیب نہیں ہوئی اور وہ ابلے ہوئے دانوں پر گزارا کر رہے ہیں۔ اپنے علاقے کی بدنصیبی کا رونا رونے کے بعد، انھوں نے مجھ سے درخواست کی کہ اگر میں ان کے لائے ہوئے دانوں کا آٹے سے تبادلہ کر دوں تو ان کے بچے مجھے دعائیں دیں گے۔ یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک خاموشی سے میرے چہرے کی طرف دیکھتے رہے اور پھر یک دم دس سیر فی

من کے حساب سے ''کٹائی'' کی پیش کش کر دی۔

اس پیش کش کا سنتے ہی میرے وجود میں لالچ بھری خوشی کی لہر دوڑ نے لگی اور مجھے کتابوں کے کمرے کی دیواریں اُسرتی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔لیکن اگلے ہی لمحے مجھے یاد آیا کہ میں نے کٹائی کے طور پر لیا ہوا سارا آٹا تو آج صبح ہی بیچ دیا تھا اب تو زیادہ سے زیادہ تیس کلو آٹا میرے پاس موجود ہوگا۔یہ سوچ کر میں کچھ مایوس سا ہو گیا اور اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ میں نے سارا آٹا کیوں بیچ دیا۔اگر اس وقت میرے پاس پچھتر سیر آٹا موجود ہوتا تو میں اس کا تبادلہ کر کے ابھی اور اسی وقت پچیس کلو آٹا کما لیتا۔پھر میرا دھیان کچھ دیر پہلے پیسی ہوئی چونگ کی طرف گیا۔ اس آدمی کے جانے کے بعد میں نے بیس سیر کی ایک ہی چونگ پیسی تھی۔جس میں سے دو سیر کٹائی رکھنے کے بعد اٹھارہ سیر آٹا موجود تھا۔

''تیس اور اٹھارہ؛ اڑتالیس سیر۔''میں دل ہی دل میں حساب لگانے لگا لیکن ستائیس سیر کے قریب آٹا تو پھر بھی کم تھا۔

مجھے اپنے خیالوں میں گم دیکھ کر وہ گویا ہوئے:

''آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں؟''

''وہ جی۔میرے پاس اس وقت صرف پچاس کلو کے قریب آٹا ہے باقی تو میں آج ہی بیچ چکا ہوں۔''میں نے مایوسی سے کہا۔

''ایک چونگ چل بھی تو رہی ہے۔اس میں سے بھی تو کچھ پس چکا ہے۔''انھوں نے پڑوں کے آگے پھیلے ہوئے گرم گرم آٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ چونگ تو ابھی آپ کے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی میں نے چڑھائی ہے۔بہ مشکل سات آٹھ کلو آٹا پِسا ہوگا۔''میں مایوسی سے گویا ہوا۔

''کوئی بات نہیں۔جو بھی موجود ہے دے دیجیے اور میرے دانے رکھ لیجیے۔میں بہت دور سے آیا ہوں اب میرے بچے سو رہے ہوں گے۔میں چاہتا ہوں کہ صبح ان کے جاگنے سے

پہلے پہلے میں گھر پہنچ جاؤں۔''بزرگ نے پریشانی کے انداز میں کہا۔

''جیسے آپ کی مرضی۔''میں نے اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے، ہمدردی کی اداکاری کی۔

''ٹھیک ہے۔ جتنا آٹا موجود ہے۔ایک بوری میں ڈال دیجیے اور میری بوری رکھ لیجیے۔''بزرگ گویا ہوئے۔

میں نے تھوڑی دیر پہلے پیسی ہوئے چونگ کو اپنی کٹائی والی بوری میں انڈیلا۔پھر گھومتے ہوئے پڑوں کے آگے بکھرا ہوا آٹا جمع کر کے اس میں ڈالا اور پاس رکھے ہوئے سُوئے سے اس کا منہ سی دیا۔

بزرگ نے اپنا منڈھا سا سر پر جمایا، آرام سے نیچے جھکے، قبل اس کے کہ میں بوری اٹھانے میں ان کی مدد کرتا، انھوں نے یک بارگی اسے اٹھایا اور بغیر کچھ کہے فوراً دروازے سے باہر نکل گئے اور میں حیرانی سے انھیں جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔

''پرانے زمانے کا بوڑھا ہے۔آج کے جوانوں سے بھی جوان۔''یہ سوچتے ہوئے، میں دروازے کی طرف لپکا تا کہ اسے بند کر کے پیچھے لکڑی کا بالا لگاؤں اور آرام کروں۔ جوں ہی میں نے ستون سے آگے بڑھنے کے لیے قدم بڑھائے، میری ٹانگیں کسی چیز سے ٹکرائیں اور میں منہ کے بل زمین پر جا گرا۔ جب میں کچھ سنبھلا اور دیکھا تو دروازہ بند تھا اور اس کے پیچھے بالا بدستور ٹکا ہوا تھا۔ میں اسی سے ٹکرا کر گرا تھا۔

پہلے تو میں کافی دیر وہیں ششدر کھڑا رہا تھا اور پھر اسے کسی عجیب وغریب خواب پر معمول کر کے بستر پر لیٹ گیا۔کچھ دیر بعد جب میں نے کروٹ بدلی تو وہاں سفید ریش اجنبی بزرگ کی اتاری ہوئی بوری دیوار کے ساتھ ایستادہ دیکھ کر اور اپنی کٹائی والی بوری نہ پا کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس رات میں لمحہ بھر کے لیے بھی نہیں سو سکا تھا صبح صادق کے وقت کہیں جا کر میری آنکھ لگی تھی اور جب میں جاگا تو سب چیزیں اپنے معمول کے مطابق تھیں۔

سفید ریش بزرگ کی بوری کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا اور میری کٹائی والی بوری اپنی جگہ پر موجود تھی۔ میں اگلے کئی ماہ تک ہر رات اس پراسرار خواب یا واقعے کو یاد کرتا رہا لیکن پھر جلد ہی میں اسے مکمل طور پر بھول گیا۔

اس واقعے کو گزرے پچاس سال ہونے کو آئے ہیں اور ابتدائی چند ماہ کو چھوڑ کر یہ شاید ہی کبھی مجھے یاد آیا ہو لیکن گزشتہ پینتالیس دنوں سے میں اس خواب آلود واقعے کو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھول پایا۔ بھولوں بھی کیسے کہ وہ بوری اس دن سے، جب میں اپنی اور اس جندر کی زندگی کی آخری چونگ پیس کر فارغ ہوا تھا، یہاں میرے سامنے موجود ہے اور اس دوران میں کسی بھی لمحے غائب نہیں ہوئی۔ مجھے اس کی موجودگی کا اب اتنا ہی یقین ہے جتنا اس بات کا کہ میں کل کا سورج چڑھتے ہوئے نہیں دیکھ پاؤں گا۔ اب تو میں اسے باقاعدہ چھو کر بھی محسوس کر سکتا ہوں۔ اس دوران میں، میں نے کئی بار سوچا کہ اسے اٹھا کر جندر کے کھارے میں انڈیل کر کیل گرا دوں اور دو چار گھنٹے آرام سے سویا رہوں لیکن مجھے ہمت نہیں ہوئی۔

زندگی کے بارے میں میرا زیادہ تر علم کتابی ہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ عملی زندگی میں، میں ایک ناکام آدمی رہا۔ایک ایسا ناکام آدمی جو کوئی بھی کام ڈھنگ سے نہیں کر سکا سوائے کہانیاں پڑھنے اور جندر چلانے کے؛ اور یہ دونوں کام ہمیشہ لازم وملزوم رہے۔

میری بیوی مجھے اسی لیے چھوڑ کر چلی گئی تھی کہ مجھے جندر کی کوُنج سنے بغیر نیند نہیں آتی تھی۔وہ عجیب وغریب عورت، میری چچا زاد تھی۔اسی چچا کی بیٹی جو میرے باپ کے مرنے کے بعد کچھ دن میرے ساتھ جندر پر بھی رہا تھا۔وہ چھ بھائیوں کی ایک ہی بہن تھی اور تھی بھی سب سے چھوٹی۔ہم دونوں کی عمروں میں بھی پورے بارہ سال کا فرق تھا۔جب میرا باپ مرا وہ پانچ سال کی تھی اور میں بھرپور جوان۔اس کے بچپنے میں، میں اسے اپنے کندھوں پر بٹھا کر جندر پر بھی لاتا رہا۔

وہ ہمارے گاؤں کی پہلی میٹرک پاس لڑکی تھی۔ان دنوں ہمارے ہاں لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج ہی نہیں تھا؛ جو لوگ تھوڑے باشعور تھے وہ بھی بہ مشکل پرائمری تک ہی بچیوں کو تعلیم دلواتے تھے کہ لڑکیوں کا ہائی سکول ان دنوں صرف بڑے قصبے میں تھا جو یہاں سے سات میل دور تھا۔قریبی گاؤں میں صرف لڑکوں کا ہائی سکول تھا اور لوگ مخلوط تعلیم کے حق میں نہیں تھے۔لیکن چچا چوں کہ خود اسی ہائی سکول میں چپڑاسی تھے لہٰذا جب اس نے مزید پڑھنے کی ضد کی اور بابا جمال دین نے بھی اس کی تائید کی تو وہ راضی ہو گئے۔وہ پورے سکول میں واحد لڑکی

تھی ۔چوں کہ بچپن میں وہ اسکول میں لیٹ داخل کرائی گئی تھی اس لیے وہ اپنے تمام ہم جماعتوں سے عمر میں بڑی تھی ۔جب اسے چھٹی جماعت میں داخل کرایا گیا تو اس کی عمر چودہ سال تھی؛ یعنی جوانی کی حدوں کو چھوتی ہوئی ۔جب کہ اس کے ہم جماعت اس سے دو تین تین سال چھوٹے۔ گھر میں چھ بڑے بھائی اور سکول میں درجنوں چھوٹے لڑکے۔شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی طبیعت میں ایک طرح کا مردانہ پن سا آگیا تھا اور وہ تھی بھی لڑکوں کی طرح نڈر اور بے باک۔ایک دفعہ اس کے کسی ہم جماعت لڑکے نے ہنستے ہنستے اسے آنکھ ماری تو اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنی جوتی اتار کر اتنے زور سے اس کے منہ پر ماری کہ بے چارے کی آنکھ پھوٹ گئی،جس کی وجہ سے چچا کی خاصی سبکی بھی ہوئی تھی۔

سکول سے واپسی پر کبھی کبھی وہ چچا کے ساتھ یہاں میرے پاس جندر پر بھی آجاتی،ہم تینوں دوپہر کا کھانا بھی اکٹھے کھاتے۔ان دنوں مجھے مطالعے کا چسکا لگ چکا تھا اور میں نے جندر کے ساتھ والے پیار کے اردگرد دیواریں کھڑی کر کے ایک کمرہ بھی اسارلیا تھا جو ایک چھوٹی سی لائبریری کی شکل اختیار کر چکا تھا۔شروع شروع میں وہ ہر ہفتے مجھ سے ایک آدھ ناول پڑھنے کے لیے لے جاتی اور جب ختم کر کے واپس لاتی تو جو حصے اس کی سمجھ سے باہر ہوتے یا اس کے نزدیک اضافی ہوتے تو ان کے بارے میں مجھ سے پوچھتی اور میں اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق اسے کہانی اور کرداروں کے حوالے سے بتاتا رہتا۔بعد میں وہ سکول سے واپسی پر یہیں میرے اور بابا جمال دین کے ساتھ شام تک ڈیرہ جمانے اور بابا جمال دین کو کہانیاں اور ناول پڑھ کر سنانے کی میری ذمہ داری میں ہاتھ بٹانے لگی اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک بابا جمال دین بیمار ہو کر بستر سے نہیں جالگا۔

جوں ہی اس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا ہر طرف سے اس کے رشتے آنا شروع ہو گئے کہ گاؤں کی پہلی میٹرک پاس لڑکی سے شادی کے خواہش مند بے شمار تھے لیکن اس نے ہر رشتے کو رد کر کے گاؤں کے سکول میں نوکری کر لی کہ ان دنوں استاد کے لیے میٹرک پاس ہونا

ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔سکول میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ طور پر اس نے مزید تعلیم بھی جاری رکھی اور بعد میں علاقے کی پہلی بی اے پاس خاتون ہونے کا اعزاز بھی اسی نے حاصل کیا۔

چوں کہ پرائمری سکول، جہاں اس کی تعیناتی ہوئی تھی، گاؤں ہی میں تھا اس لیے اب اسے میرے ہاں بطور خاص آنا پڑتا تھا لہٰذا اب وہ کم کم ہی آتی تھی۔تاہم جب بھی آتی میرے لیے اپنے ہاتھوں سے کھانا بنا کر لاتی۔اب اس کی سوجھ بوجھ میں کافی اضافہ ہو چکا تھا؛ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ادب کے علاوہ نفسیات، تصوف، سائنس، فلسفہ، تاریخ اور اس نوعیت کے دیگر علوم میں بھی دل چسپی لینے لگی تھی۔ان علوم سے استفادے نے اس کے ادبی ذوق کو مزید نکھار دیا تھا۔ وہ جب مختلف افسانوں اور ناولوں کے کرداروں کے حوالے سے اپنا تجزیہ پیش کرتی اور مجھے اس کے پیش کیے گئے تجزیوں پر رشک آتا اور بعض اوقات تو مجھے حسد ہوتا کہ میں نے اس کہانی یا ناول کو اس طرح کیوں نہیں دیکھا۔

ایک دن جب میں نے اس رشک کا اظہار کیا تو اس نے الٹا یہ کہہ کر مجھے حیرت سے دوچار کر دیا کہ مجھے تمھاری زندگی پر رشک آتا ہے۔جب میں نے اس سے پوچھا کہ میں تو بالکل ایک عام سی زندگی گزار رہا ہوں تو اس نے کہا کہ ''تم ایک آزاد مرد ہو۔زندگی کے تمام بندھنوں اور بکھیڑوں سے آزاد۔اور مجھے ایسے لوگ اچھے لگتے ہیں جو اپنی مرضی کی زندگی گزارتے ہیں اور کسی کی کوئی پروا نہیں کرتے۔''

اس کی دیکھا دیکھی میں بھی ان علوم میں دلچسپی لینے لگا جب اسے اس کا علم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئی اور اس نے مجھے ان علوم کی ابتدائی کتابیں مہیا کرنا شروع کر دیں۔جہاں کہیں مجھے سمجھنے میں مشکلات پیش آتیں وہ ایک استانی کی طرح میری رہنمائی کرتی۔

انھی دنوں مجھے چچا کا پیغام ملا کہ میں ان سے ملوں۔میں جب چچا کے گھر پہنچا تو وہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے لیکن میں جیسے ہی گھر میں داخل ہوا؛ انھوں نے یوں ظاہر کیا جیسے

کوئی خاص بات نہ ہو۔ میں ان کے پاس کافی دیر تک بیٹھا رہا اور وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ مثلاً یہ کہ جندر کیسا چل رہا ہے۔ آئندہ کے کیا ارادے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کی باتیں کرتے کرتے جب انھوں نے کہا کہ بیٹا اب تمھاری شادی کی عمر گزرتی جا رہی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اب تم شادی کے بارے میں بھی سوچو تو مجھے حیرت ہوئی، کہ چچا کو آج اچانک میری شادی کا خیال کیسے آ گیا؟

اگلے تین چار دنوں میں مجھ پر اصل صورت حال واضح ہو گئی؛ کہ حاجرہ نے میٹرک کے فوراً بعد ہی ضد شروع کر دی تھی کہ وہ مجھ سے شادی کرے گی نہیں تو ساری عمر کنواری بیٹھی رہے گی اور میری چچی اپنی بیٹی کی عمر سے بارہ سال بڑے شخص کے ساتھ اسے بیاہنے پر راضی نہیں ہو رہی تھیں۔

شادی سے پہلے، میں نے گاؤں میں موجود اپنا آبائی گھر جو میری ماں کے مرنے کے بعد سے بند پڑا تھا اور جس کی کڑیوں، بالوں اور بلیوں کو دیمک کھا چکی تھی، نئے سرے سے تعمیر کروایا۔ اس کی ڈولی وہیں اتاری گئی تھی۔ شادی کے بعد اس گھر میں ہم نے اکٹھے بہ مشکل اٹھارہ دن گزارے۔ اس کے بعد میں اسے اپنے ساتھ یہیں لے آیا تھا کہ ان اٹھارہ دنوں میں، کسی بھی رات، میں سکون سے نہیں سو سکا تھا، حالاں کہ میرے ان شادی شدہ دوستوں نے جنھیں یہ فریضہ سونپا گیا تھا کہ وہ مجھے ہم بستری کے رموز و اسرار سمجھائیں، مجھے بتایا تھا کہ ہم بستری کے بعد عورت بے چین رہتی ہے اور مرد پر شدید نیند کا غلبہ طاری ہو جاتا ہے اس لیے جب تک تمھاری دلھن سو نہ جائے، تم بھی جاگتے رہنے کی کوشش کرنا۔ ورنہ تمھیں آرام سے سویا ہوا دیکھ کر وہ بے چاری کڑھتی رہے گی، جس کا آئندہ ازدواجی زندگی پر برا اثر پڑھ سکتا ہے۔ لیکن ان اٹھارہ دنوں میں ہم دونوں رات کے پچھلے پہر تک تقریباً جاگتے ہی رہتے۔ انیسویں دن جب میں نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ ہم کل سے اپنے جندر پر چلے جائیں گے اور وہیں رہا کریں گے تو اس نے یہ کہہ کر؛ ''جیسے تم چاہو۔'' مجھے حیران کر دیا تھا۔

اگلے ہی دن ہم نے اپنا مختصر سا سامان اٹھایا اور جندر پر منتقل ہو گئے ۔ وہ صبح سویرے اٹھ کر اپنا اور میرا ناشتہ تیار کرتی اور سکول روانہ ہو جاتی ۔ دن کا کھانا میں تیار کرتا کہ اس کی واپسی تک سہ پہر ہو جاتی ۔ سہ پہر کے کھانے کے بعد جندر کی باگ ڈور وہ اپنے ہاتھ میں لے لیتی اور میں آرام سے لیٹا رہتا ۔ جوں ہی چونگ ختم ہوتی وہ پھرتی سے اگلی چونگ کھارے میں انڈیل کر؛ پاٹوں کے آگے پڑا آٹا سمیٹ کر بوری میں ڈالتی اور اسے ٹھکانے لگا دیتی ۔ اسی دوران میں وہ ساتھ ساتھ رات کا کھانا بھی تیار کر لیتی ۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم دونوں کوئی کتاب کھول لیتے اور بابا جمال دین کی ، جو ان دنوں فوت چکا تھا ، موجودگی کا تصور کر کے مطالعے میں جت جاتے ۔ پہلے دس صفحے میں با آواز بلند پڑھتا اور پھر اگلے دس صفحے وہ؛ جہاں کہیں کوئی الجھاؤ ہوتا ہم کتاب بند کر کے اسے دور کرتے اور سونے سے پہلے دونوں اس پر کھل کر بحث کرتے ۔ رات دس بجے کے قریب ہم دونوں مل کر ایک بڑی چونگ کھارے میں انڈیلتے اور سو جاتے ۔

بظاہر تو وہ خوش خوش تھی لیکن میں جانتا تھا کہ آٹے سے اٹھنے والی دھول اور جندر کی گونج نے اس کا جینا دوبھر کر رکھا تھا ۔ اسے ہر روز صبح سویرے سکول جانے کے لیے خصوصی طور پر تیار ہونا پڑتا کہ رات بھر آٹے سے اٹھنے والی دھول اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیتی ۔ علاوہ ازیں گاؤں کا پرائمری سکول جہاں وہ ہر روز پڑھانے جاتی تھی جندر سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھا ، یوں اسے ہر روز تین میل کا سفر پیدل طے کرنا پڑتا تھا ۔ سہ پہر کے وقت جب وہ لوٹتی تو خاصی تھکی ہوئی ہوتی تھی لیکن اس نے کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لایا ۔

ایک دن جب اس نے کہا کہ کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم جندر بند کر کے لائبریری والے کمرے میں سو جایا کریں تو میں نے اسے اپنی مجبوری سے آگاہ کر دیا کہ مجھے جندر کی گونج سنے بغیر نیند نہیں آتی ۔ یہ سنتے ہی یک دم اس کا مزاج بگڑ گیا ۔ اس نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور سسکیاں بھر کر رونے لگی ۔ میں نے بھی اسے چپ کرانے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ میری

دانست میں یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ اس پر رونا دھونا شروع کر دیا جائے چناں چہ میں منہ دوسری طرف کر کے لیٹ گیا۔ تقریباً تین گھنٹوں بعد جیسے ہی جندر کی آواز تبدیل ہونے سے میری آنکھ کھلی اور میں اگلی چونگ کھارے میں انڈیلنے کے لیے اٹھا میں نے دیکھا کہ وہ ابھی تک جاگ رہی ہے اور بدستور رو بھی رہی ہے۔

میں نے اگلی چونگ کھارے میں انڈیلی؛ جندر کے آگے پڑا آٹا سمیٹ کر بوری میں ڈالا اور ہاتھ دھوکر پیار سے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ لیکن وہ جوں کی توں لیٹی سسکیاں بھرتی رہی۔ تنگ آ کر جب میں نے اسے ڈانٹا کہ اس میں رونے دھونے والی کونسی بات ہے تو اس کے اندر دبا ہوا غصہ ابل پڑا:

''میں نے ایک آزاد مرد سے شادی کی تھی مجھے کیا پتا تھا کہ وہ جندر کی کوک کا قیدی ہے۔ میں ایک معذور مرد کے ساتھ تو زندگی گزار سکتی ہوں لیکن ایک مجبور مرد کے ساتھ نہیں۔ تمھیں اس مجبوری سے آزاد ہونا پڑے گا۔'' اور میں ہکا بکا ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگا۔

صبح وہ بغیر ناشتہ کیے سکول چلی گئی تو مجھے معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا۔ میں کچھ دیر اس معاملے پر سوچتا رہا اور اس کے پلٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ میرے نزدیک اب بھی یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا؛ میں نے سوچا کہ میں اسے کسی نہ کسی طرح منا لوں گا۔ وہ پڑھی لکھی عورت ہے مان جائے گی۔

سہ پہر کے وقت وہ جیسے ہی پلٹی۔ میں نے دیکھا کہ اس کا مزاج بدستور بگڑا ہوا ہے۔ میں اس وقت جندر کے صحن میں بنے تھڑے پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ آتے ہی کتابوں والے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ باہر نکلی تو اپنا مختصر سا سامان اس کی بغل میں تھا۔

''اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمھارے ساتھ رہوں تو تمھیں جندر چھوڑ کر کوئی اور کام کرنا پڑے گا۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی؛ اور میں اس کے بدلے ہوئے لہجے کے زیر و بم پر حیرت میں ڈوبا اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے پہلی دفعہ مجھے یوں مخاطب کیا تھا۔ پہلے تو کئی

دن تک، میں اس کے اس فیصلے کو محض جذباتی فیصلہ سمجھتا رہا لیکن جب وہ دو ماہ تک اپنے فیصلے پر متواتر قائم رہی تو مجھے ہار ماننا ہی پڑی اور میں نے جندر اپنے ایک عزیز کے حوالے کر کے گاؤں میں لکڑی کا ٹال لگالیا۔ جس دن اسے پتا چلا کہ میں نے جندر چھوڑ دیا ہے وہ اسی شام اپنے گھر واپس آ گئی۔

میں پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ اس کی واپسی کی صورت میں اس سے کسی قسم کی جرح نہیں کروں گا کہ مبادا بات بگڑ جائے۔ اس نے بھی شاید واپس گھر میں قدم رکھتے ہوئے ایسا ہی کوئی فیصلہ کرلیا تھا۔ چناں چہ نہ تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اتنی سی بات پر گھر چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھی اور نہ اس نے اس بارے میں کوئی بات کی۔ ایک دو دن تو ہم دونوں تقریباً خاموش ہی رہے اور رات ایک ہی کمرے میں الگ الگ سوتے۔ پھر ایک رات اس خاموشی سے تنگ آ کر میں چپکے سے اٹھ کر اس کی چارپائی پر چلا گیا، مجھے سخت حیرانی ہوئی کہ میں جس سرد مہری کی توقع کر رہا تھا اس کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا ہم دونوں ٹوٹ کر ملے اور اسی روز حالات دوبارہ معمول پر آ گئے۔

شام کو جب میں تھکا ہارا گھر آتا تو وہ آنکھیں فرشِ راہ کیے ہوتی۔ وہ پہلے سے بڑھ کر میری دل جوئی کا سامان کرتی اور مجھے جسمانی اور روحانی دونوں سطح پر سکون پہنچانے کی کوشش میں لگی رہتی۔ اسے اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ میں یہ سب کچھ مجبوری کی تحت کر رہا ہوں اور یہ کہ جندر کو چھوڑ کر میں کچھ بے چین سا ہو گیا ہوں۔ ''مرد کو مجبور نہیں ہونا چاہیے۔ اور تم جیسے مرد کو تو بالکل بھی نہیں۔'' وہ کہتی۔ ''تھوڑا حوصلہ کرو۔ ایک دن تمھیں جندر کی گونج کے بغیر بھی ایسی پر سکون نیند آنا شروع ہو جائے کہ کبھی جندر پر بھی نہیں آئی ہو گی۔''

ادھر معاملہ بالکل الٹ تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا میرا سکون مزید غارت ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے ساری ساری رات جاگ کر گزارنا پڑتی جس کی وجہ سے میری صحت گرنا شروع ہو گئی، جس کا بعد میں، میں نے یہ حل نکالا کہ دوپہر کے وقت جب تمام لوگ اپنا کام دھندا ختم

کر کے گھروں میں آرام کررہے ہوتے، میں چپکے سے جندر کا رخ کرتا اور جندر روئی کو، جو میرا دور پار کا رشتہ دار تھا، یہ کہہ کر کہ وہ گھر جا کر آرام کرے، جندر کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لیتا اور کوئی بھاری چونگ کھارے میں انڈیل کر سہ پہر تک آرام سے سویا رہتا؛ لیکن میں نے اس کی بھنک تک حاجرہ کے کانوں میں نہیں پڑنے دی کہ مبادا اس کا مزاج دوبارہ بگڑ جائے۔

جوں توں کر کے میں نے سال گزار دیا۔ جب راحیل پیدا ہوا تو میں نے سوچا کہ اب وہ میرے گھر سے بندھ گئی ہے، نومولود کو لے کر کہاں جائے گی۔ سو میں نے تھوڑے ہی دنوں میں، اسے بتائے بغیر، نال اسی عزیز کے حوالے کر دیا اور دوبارہ یہاں آ بیٹھا۔ اب کی بار وہ گھر چھوڑ کر تو نہیں گئی لیکن اس کا رویہ یک سر بدل گیا۔ شروع کے دنوں میں، میں روزانہ رات کو گھر چلا جاتا؛ اور جان بوجھ کر دیر سے جاتا تاکہ زیادہ دیر اس کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ جوں ہی میں گھر میں داخل ہوتا وہ کھانا لا کر میرے سامنے رکھ دیتی۔ ابھی میں کھانا کھا ہی رہا ہوتا کہ میرا بستر بھی بچھ جاتا، کھانا کھا کر، اس سے نظریں چار کیے بغیر، میں چپکے سے بستر میں گھس جاتا اور وہ بچے کو لے کر دوسری چارپائی پر سو جاتی۔

ہفتہ بھر بعد ایک رات میں چپکے سے اٹھا، اس کے پہلو میں سوئے ہوئے بچے کو اٹھا کر دوسری چارپائی پر ڈالا اور اس کے بستر میں گھس گیا۔ اس کا منہ دیوار کی طرف تھا، میں کافی دیر اس کی پشت سے لپٹا رہا لیکن اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور بے حس و حرکت پڑی سوچتی رہی۔ پھر یک دم اس کے بدن میں ایک جنبش سی ہوئی، میرا دل فرطِ جذبات سے بلیوں اچھلنے لگا اور میری رگوں میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ وہ خاموشی سے اٹھی؛ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھے بغیر اپنے آپ کو بے لباس کیا اور وہ بچھ گئی۔ میں جب اس کے بدن کو اپنا لباس بنانے کے لیے اس پر جھکا تو اس کا بدن برف باری کے بعد، شفاف آسمان سے اترنے والی اوس کے سبب، جمنے والی کہرے کی سخت اور موتی تہہ کے مانند، ٹھنڈا یخ تھا۔ اس کے بدن کا لمس پاتے ہی میری رگوں میں دوڑتا خون جم کر رہ گیا۔ میں کافی دیر تک دل کو گرمانے اور اپنی رگوں

میں جمے خون کو گردش میں لانے کی کوشش کرتا رہا تا کہ اس کے جذبات کی برف پگھلانے میں کامیاب ہوسکوں لیکن میں ناکام رہا۔

میں اٹھا بچے کو اٹھا کر اس کے بستر پر ڈالا اور اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ مجھے ایک عجیب سی ندامت، شرمندگی اور خجالت نے آن گھیرا۔ نیند تو مجھے ویسے بھی گھر میں نہیں آتی تھی لیکن ایسی کرب ناکی کی کیفیت کا سامنا مجھے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ صدیوں پر بھاری وہ رات میں نے بڑی مشکل سے کاٹی۔ اس کا ایک ایک لمحہ کرچی بن کر میرے دل میں اترتا رہا۔ صبح شرمندگی کی وجہ سے میں بغیر ناشتہ کیے جندر پر چلا آیا۔

اسی رات کے کسی خجالت بھرے لمحے میں، جس کے ہر لمحے کی چبھن اب گزشتہ پینتالیس دنوں سے میں دوبارہ اسی شدت سے محسوس کر رہا ہوں، میں نے اپنے آپ سے عہد کر لیا تھا کہ آئندہ میں اس وقت تک اس کے بستر میں نہیں جاؤں گا جب تک اس کی آنکھوں میں طلب کی جھلک نہ دیکھ لوں۔

آہ! یہ میری تمنا ہی رہی۔ باوجود اس کے کہ میں اگلے تین ماہ تک متواتر گھر جاتا رہا، میں اس قسم کی کوئی جھلک کبھی اس کی آنکھوں میں نہ دیکھ سکا۔ رفتہ رفتہ میں نے بھی گھر جانا کم کر دیا اور سال بھر کے بعد یہ سلسلہ تقریباً موقوف ہو کر رہ گیا اور یوں ہمارے درمیان ایک طرح سے خاموش علاحدگی طے پا گئی۔ البتہ میں اسے خرچہ بدستور بھجواتا رہا اور اس نے بھی کبھی لینے سے انکار نہیں کیا۔

کچھ عرصہ وقت رک رک کر چلتا رہا جیسے اس کی چال میں لنگ سا آ گیا ہو لیکن پھر اپنی معمول کی رفتار سے گزرنے لگا۔ ہاں جب کبھی مجھے اس کے ساتھ گزرے لمحے یاد آتے تو اس کی چال میں دوبارہ لنگ سا آ جاتا اور بعض اوقات تو بالکل ہی ٹھہر سا جاتا مگر کب تک، زخم جدائی کا بھی کیوں نہ ہو بھر ہی جاتا ہے۔

تقریباً پچیس سال بعد، جس دن راحیل کو پہلی تنخواہ ملی، اس نے مجھے پیغام دے بھیجا

کہ میں آئندہ اسے پیسے نہ بھیجوں؛ اب اسے اس کی ضرورت نہیں رہی۔ سو اس کے بعد میں نے اسے کبھی پیسے نہیں بھیجے۔ راحیل کی نوکری کے کچھ ہی عرصے بعد وہ سکول کی ملازمت سے قبل از وقت ہی سبکدوش ہوگئی اور راحیل اسے اپنے ساتھ شہر لے گیا پھر وہ کبھی گاؤں واپس نہیں آئی۔

پانچ سال پہلے جب اس کی موت واقع ہوئی تو راحیل نے اس کی تدفین وہیں کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی وصیت کے مطابق مجھے بھی اطلاع دی گئی۔ میں جنازے میں شریک ضرور ہوا لیکن تدفین کے بعد اسی شام واپس آ گیا۔

حادثہ سے علاحدگی کے بعد گاؤں میں میرا آنا جانا، جو پہلے بھی کم ہی تھا مزید کم ہو گیا۔ لیکن گاؤں والوں سے میرا رشتہ اس وقت تک نہیں ٹوٹا جب تک گاؤں والے ٹریکٹر نامی فتنے سے آشنا نہیں ہوئے۔ اس فتنے نے گاؤں سے میرا رابطہ آج سے تقریباً پچیس سال پہلے اسی طرح منقطع کر دیا تھا جیسے پیٹرول سے چلنے والا مصنوعی جندر آج حقیقی زندگی سے میرا رابطہ ہمیشہ کے لیے منقطع کر رہا ہے۔

اگر چہ گاؤں میں میری زرعی زمین نہ ہونے کے برابر تھی اور میں اس کی بوائی اور کٹائی کا کام تن تنہا بھی کر سکتا تھا لیکن اس کے باوجود فصلوں کی کٹائی کے موسم میں مجھے لوگوں کی لیتریاں نکالنے ہر حال میں گاؤں جانا پڑتا تھا۔ ان دنوں لیتریوں کے بغیر گاؤں کی زندگی کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ گاؤں کی تمام فصلوں اور گھاس وغیرہ کی کٹائی اور گاہی لیتری کی صورت میں مشترکہ طور پر ہوتی تھی۔ فصلیں تیار ہوتے ہی گاؤں کے تمام افراد مل کر گاؤں کے ایک سرے سے ان کی کٹائی بلاتفریق شروع کرتے، اور ہفتہ، دس دنوں میں پورے گاؤں کی فصلوں کا صفایا کر دیتے تھے۔ کٹائی کا موسم شروع ہوتے ہی گاؤں کے وہ لوگ بھی جو نوکری پیشہ ہوتے یا کاروبار اور محنت مزدوری کرنے شہر گئے ہوتے؛ گاؤں پلٹ آتے اور لیتری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ لیتری سے غیر حاضری کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا اور جو شخص بغیر کسی مجبوری کے مسلسل تین لیتریوں سے غائب ہوتا نہ صرف اس کی فصل کھڑی گلتی سڑتی رہتی بلکہ وہ گاؤں میں تنہا بھی رہ جاتا تھا۔

مجھے نہیں معلوم اس سراسر رضا کارانہ تنظیم کا آغاز کب ہوا۔شاید زرعی دور کے آغاز ہی سے، جب انسان نے خانہ بدوشی کی زندگی ترک کر کے سکونت اختیار کی اور مل جل کر رہنا سیکھا تو اس نے ایک اجتماعی معاشرے کے قیام کے لیے اس رسم کو ایجاد کیا اور پھر یہ نسل در نسل منتقل ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی۔میرے باپ کو، میری ماں کی موت کے بعد اسی لیتری نے اپنی ذات برادری سے جوڑے رکھا۔وہ کم گو ہونے کے ساتھ ساتھ مردم بیزار بھی تھا، لیکن وہ بھی کٹائی کا موسم شروع ہوتے ہی، جندر کی دیوار میں ٹھونکی لکڑی کی میخ سے لٹکا اوزاروں کا تھیلا اتارتا، اس میں سے درانتی اور لوہے کی ریتی نکالتا اور درانتی کے دندانے، جو گزشتہ موسم میں گھس چکے ہوتے، تیز کرنا شروع کر دیتا، پھر جوں ہی اسے کٹائی کے آغاز والے دن کی اطلاع ملتی فجر دم مقررہ مقام پر پہنچ جاتا۔

کٹائی شروع کرنے سے پہلے گاؤں کے کسی ایسے بزرگ کو، جو چل پھر سکتا ہو، پورے گاؤں کے کھیتوں کا دورہ کرایا جاتا تھا، وہ گاؤں کے مشرقی حصے میں موجود پہلے کھیت سے لے کر مغرب کے آخری کھیت تک فصلوں کا معائنہ کرتا مختلف کھیتوں سے گندم کے سٹے توڑ کر ہتھیلی پر مروڑتا؛ اگر مکئی کی فصل ہوتی تو کھڑے ٹانڈوں سے چھلیوں کو چھیلتا اور کٹائی کے آغاز والے دن اور مقام کا تعین کرتا۔

کٹائی کے آغاز سے ایک دن پہلے تمام لوگ مسجد میں جمع ہوتے اور جو موجود نہ ہوتے انھیں وہاں موجود افراد کے ذریعے کٹائی کے آغاز والے دن اور مقام کے بارے میں مطلع کر دیا جاتا۔مقررہ دن نماز فجر کے بعد تمام لوگ مقررہ مقام پر دو صفیں بنا کر کھڑے ہو جاتے۔اگلی صف درانتی بردار لوگوں کی ہوتی جب کہ اس سے پچھلی صف جو نسبتاً چھوٹی ہوتی، درانتیوں سے تہی؛ مولوی صاحب برکت کے لیے دعا کراتے، جوں ہی دعا ختم ہوتی اور وہاں موجود میراثی اپنے گلوں میں لٹکے ڈھولوں پر ڈنڈے برسانا شروع کرتے۔اگلی صف کھیتوں میں گھس جاتی اور درانتیاں چلنے کی آواز بلند ہونا شروع ہو جاتی جب کہ پچھلی صف میں موجود لوگ کٹی ہوئی فصل کے گھٹڑے بنا کر، متعلقہ زمین مالک کے گھر پہنچانا شروع کر دیتے۔

ناشتے اور کھانے کا انتظام کسی ایک ہی گھر میں کیا جاتا تھا، اس گھر کا تعین فصلوں کی مقدار اور کٹائی کرنے والوں کی تعداد کو مدنظر رکھ کر کیا جاتا کہ ناشتے یا کھانے کے وقت تک لیتری کہاں تک پہنچ چکی ہوگی جب کہ اس کے اخراجات ان تمام لوگوں کے ذمے ہوتے، جن کی فصل کاٹی جا رہی ہوتی، لیکن حصہ بقدر جثہ کے کلیے کے تحت یہ اخراجات، فصل کی مقدار کے مطابق تقسیم کیے جاتے تھے۔ اگلے دن یہ انتظام کوئی اور گھر سنبھال لیتا تھا اور اخراجات ان دوسرے لوگوں کے ذمے لگا دیے جاتے، جن کی فصل اس دن کاٹی جا رہی ہوتی۔ دن کا کھانا عموماً سادہ ہوتا جب کہ رات کے کھانے میں لیتری میں شریک لوگوں کی تواضع دیسی گھی اور مرغ یا بکرے وغیرہ کے گوشت سے کی جاتی تھی۔

گندم کی کٹائی کے دنوں میں چوں کہ گرمی ہوتی اس لیے دوپہر کے کھانے کے بعد دو تین گھنٹے کا وقفہ ہوتا جب کہ مکئی کی کٹائی کے دنوں میں، معتدل موسم کے باعث دن کے کھانے کے فوراً بعد دوبارہ کٹائی شروع کر دی جاتی اور مغرب کی اذانوں تک جاری رہتی۔

جس دن مسجد میں کٹائی کا اجلاس ہوتا، سر شام ہی مجھے اس کی اطلاع پہنچا دی جاتی؛ اس رات میں دو دو چونگیں اکٹھی کھارے میں پلٹاتا اور جندر کے پچھواڑے جا کر کٹھے کے کنارے لگے لکڑی کا پشتہ بھی تھوڑا کھینچ کر اوپر کر دیتا تاکہ جندر کے چرخے کی طرف پانی کا بہاؤ کچھ کم ہو اور جندر کی رفتار دھیمی رہے اور وہ چونگ پینے میں زیادہ دیر لگائے کہ میں زیادہ دیر تک سکون کی نیند سو سکوں اور صبح تازہ دم ہو کر لیتری میں شرکت کر سکوں نماز فجر کے بعد، میں پانی موڑ کر جندر روکتا، پاٹوں کے آگے بکھرا ہوا آٹا بوریوں میں ڈال کر کوچی سے کمرے کی صفائی کرتا۔ پھر اپنی درانتی، جس کے دندانوں پر ریتی پہلے ہی پھیری جا چکی ہوتی، نکالتا، اندھیرے میں اس کے دندانوں پر ہاتھ پھیر کر ان کی دھار کو محسوس کرتا، اپنا صافہ مونڈھے پر رکھتا اور جندر کے دروازے کو جندرا چڑھا کر گاؤں کی راہ لیتا۔ پو پھٹے میں پہاڑی عبور کر کے گاؤں میں داخل ہو رہا ہوتا۔ اگرچہ میرا گھر اسی راستے میں پڑتا ہے لیکن میں شاذ ہی گھر کے صحن کی طرف جاتا۔ جب میں لیتری آغاز کرنے کے

لیے طے کیے گئے مقام پر پہنچتا تو وہاں اور لوگ بھی پہنچ چکے ہوتے اور میں سیدھا درانتی بردار صف میں کھڑا ہو جاتا کہ مجھے فصل کے گٹھے اٹھا کر گھروں تک پہنچانا، کٹائی کی نسبت مشکل لگتا تھا۔

دن بھر کٹائی کے بعد رات کا کھانا کھاتے ہی میں دوبارہ جندر کا رخ کرتا اور کوئی بھاری چونگ کھارے میں انڈیل کر نیند کی آغوش میں چلا جاتا۔لیکن دن بھر کی تھکاوٹ کے باوجود جوں ہی دانے ختم ہوتے اور جندر کی آواز تبدیل ہوتی میری آنکھ کھل جاتی اور مجھے دوبارہ نئی چونگ کھارے میں انڈیلنے اور کھائی میں پڑے آٹے کو سمیٹنے کے لیے اٹھنا پڑتا۔

فصلوں کی کٹائی کے آغاز سے پہلے ہی گاؤں کی خواتین اپنے گھروں کے صحنوں یا کھلیانوں کی گارے سے لپائی شروع کر دیتیں تاکہ گاہ گاہنے کے لیے راہ ہموار کی جا سکے۔جوں ہی کٹائی ختم ہوتی اور گندم کے گٹھڑے سوکھ کر گاہنے کے قابل ہوتے لوگ مختلف ٹولیوں میں بٹ جاتے اور بیلوں کو جوت کر اور ان کے پیچھے کاہو کی سوکھی پھلنگیں باندھ کر اور ان کے اوپر بھاری پتھر رکھ کر گاہی شروع کر دیتے۔بچے ان پتھروں کے اوپر بیٹھ کر سواری کا مزہ لیتے اور ہاتھوں میں کاہو کی پتلی سوٹیاں لیے بیلوں کو ہنکارتے۔جب گندم کے گٹھے بھوسے کی شکل اختیار کر چکتے اور دانے جھڑ چکتے تو مرد ترنگلیں لے کر ہوا کا رخ بھانپتے اور بھوسا اڑاتے، جس سے دانے ایک طرف جب کہ بھوسا اڑ کر دوسری طرف جا گرتا۔اگلے ایک دو دنوں میں، صحن میں، ایک طرف دانوں کی جب کہ دوسری طرف بھوسے کی ڈھیریاں بنی ہوتیں۔باقی کا کام گھر کے افراد خود سنبھال لیتے۔مرد بھوسے کو ٹھکانے لگانے کا کام شروع کر دیتے جب کہ عورتیں چھاج لے کر دانوں کو مزید صاف کرنے کا کام شروع کر دیتیں۔غلے کی مکمل صفائی کے بعد اسے تولا جاتا اور غریب غربا کے لیے عشر الگ کر کے ان کے گھروں میں پہنچا دیا جاتا۔

مکئی کی فصل کی کٹائی کے بعد اسے کھیت ہی کے ایک سرے میں گٹھے بنا کر کھڑا کر دیا جاتا تاکہ اس کے بھٹے اچھی طرح سوکھ جائیں۔ان گٹھوں کو کھڑا کرنے کے لیے قریبی جنگل سے چیڑ کے لمبے ڈال کاٹ کر لائے جاتے۔ڈال کا ایک سرا کھیت کے کسی کونے میں موجود ٹیلے میں

ٹھونکا جاتا جب کہ دوسری طرف اسے سہارنے کے لیے چار چار فٹ کے دو شاخے بالے زمین میں ٹھونک کر اوپر سے آپس میں ملا دیے جاتے۔ پھر اس کے دونوں طرف مکئی کے گٹھے کھڑے کر دیے جاتے۔ ہفتہ بھر بعد جب مکئی مکمل طور پر سوکھ جاتی تو عورتوں کی ایک ٹولی گٹھے اٹھا کر زمین پر رکھتی اور چھلیاں علاحدہ کرنے کا عمل شروع کر دیتی۔ یہ کام صرف خواتین ہی کرتیں مردوں کا کام صرف چھیلی ہوئی چھلیوں کو گھر پہنچانے تک محدود ہوتا۔

کچھ دنوں تک یہ چھلیاں گھروں کے صحنوں میں مزید سوکھنے کے انتظار میں پڑی رہتیں۔ پھر ان کے کوٹنے کا عمل شروع ہوتا۔ کوٹنے کا یہ عمل بھی کٹائی کی طرح مشترکہ ہوتا ہر روز آٹھ دس لوگ (اس کا انحصار اس بات پر ہوتا کہ مکئی کتنی ہے) مل کر کسی ایک گھر کی مکئی کوٹتے۔ گندم گاہنے کا عمل ہمیشہ دن کو جب کہ مکئی ہمیشہ رات کو کوٹی جاتی۔ باقی کا کام پھر سے عورتیں سنبھال لیتیں اور چھاج لے کر دانوں کی صفائی کا کام شروع کر دیتیں۔

ان دنوں گھروں کی تعمیر میں بھی لوگ رضا کارانہ طور پر حصہ لیتے۔ جب کوئی شخص نیا مکان بنانے کا منصوبہ بناتا گاؤں کے بیشتر لوگ اس میں بلا معاوضہ ہاتھ بٹانے آتے تھے۔ دیواروں کی چنائی کرنے والے مستری کے علاوہ کسی کو معاوضہ دینے کا رواج نہیں تھا۔ چوں کہ اس علاقے میں ہر سال سردیوں میں برف پڑتی ہے اس لیے یہاں بنائے گئے مکانوں کی چھتوں پر ٹنوں کے حساب سے مٹی ڈال جاتی تھی تاکہ چھت ٹپکنے سے محفوظ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکان کی تعمیر کا سب سے اہم مرحلہ جنگل سے بھاری کڑیاں اور بالے اٹھا کر لانا اور پھر چھت پر مٹی ڈالنا ہوتا تھا۔ کڑیاں لانے کے لیے لوگوں کی ایک پوری ٹولی جنگل کا رخ کرتی اور بھاری کڑی کے دونوں سروں پر کاہو کے مضبوط ڈنڈے باندھ کر چار آدمی اسے اٹھاتے اور چل پڑتے جوں ہی ان میں سے کوئی آدمی تھکتا کوئی دوسرا اپنا کندھا بڑھا دیتا اور پہلا کڑی کے نیچے سے ایک طرف سرک جاتا۔ مٹی ڈالنے کے عمل کو پہوچھی کہا جاتا تھا۔ پہوچھی میں گاؤں کے ہر گھر سے ایک آدمی ضرور شرکت کرتا۔ حتیٰ کہ میں بھی جو عمومی طور پر کم ہی گاؤں کا رخ کیا کرتا تھا، مکان کی پہوچھی کرانے

ضرور جایا کرتا تھا۔

لیتری یہ بھوچھی اوراس طرح کی دوسری رضا کار تنظیموں نے لوگوں کو ایک دوسرے سے باندھ رکھا تھا اور ان کے بغیر گاؤں میں کسی بڑے کام کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لوگ جنازے کو تو فرض کفایہ سمجھ کر چھوڑ دیتے تھے لیکن ان چیزوں پر فرضِ عین کی طرح عمل کرتے تھے۔ یہاں تک کہ گاؤں کے مولوی صاحب ان لوگوں کو تو معاف کر دیتے تھے جو صرف نمازِ عید پڑھنے سال کے بعد مسجد کا رخ کرتے لیکن لیتری سے غیر حاضر ہونے والوں کو یوں دیکھتے تھے جیسے وہ کافر ہوں۔

میرا ماموں جو اپنے والدین کی اکلوتی نرینہ اولاد، اور گاؤں کا پہلا میٹرک پاس تھا؛ واحد آدمی تھا، جس نے ان رسموں سے خاموش بغاوت کی تھی۔ وہ اپنی تعلیم مکمل ہونے کے بعد شہر چلا گیا تھا اور وہاں اسے ایک سرکاری ادارے میں اچھی نوکری مل گئی تھی۔ شروع شروع میں تو وہ بھی کٹائی کے موسموں میں گاؤں آ جاتا لیکن رفتہ رفتہ وہ لیتری سے غیر حاضر رہنے لگا اور اپنی فصل دوسرے گاؤں سے مزدور منگوا کر کٹوانے اور گاہوانے لگا۔ پھر اس نے اپنی زمین کسی کو ٹھیکے پر دے دی جو اس کے حصے کے دانے ہر سال شہر پہنچا دیا کرتا تھا۔ جب وہ مرا اور اس کے بیٹے اس کی میت لے کر گاؤں آئے تو اس کی قبر مجھے اور اس کے دو بیٹوں کو تنہا کھودنا پڑی تھی کہ گاؤں کا کوئی بھی آدمی اس کی قبر کھودنے نہیں آیا تھا تاہم جنازے میں پورا گاؤں شریک ہوا تھا کہ اس نے بھی کسی کا جنازہ نہیں چھوڑا تھا اور اگر وہ کسی وجہ سے نہیں آ سکا تو اپنی بیوی یا بیٹے کو ضرور بھجوایا تھا۔

معلوم نہیں کہ یہ میرے ماموں کی روح کی بددعا تھی یا اتفاق، اس کی موت کے اگلے ہی سال علاقے میں ٹریکٹر اور تھریشر آ گئے۔ اس سال کٹائی تو لیتری کے ذریعے ہوئی مگر گاہی تھریشر کے ذریعے۔ اس بار کھلیان اور صحن یوں ہی لیپے پڑے رہ گئے اور فصلیں صحنوں یا کھلیانوں میں اکٹھی کرنے کے بجائے گاؤں سے گزرنے والی سڑک کے کنارے پہنچائی گئیں اور وہیں

تھریشر کے ذریعے گاہی گئیں۔گاؤں کے لوگوں کے لیے یہ انقلاب عظیم تھا،بیلوں کی دو جوڑیاں جو کام تین دنوں میں کرتیں تھریشر دو تین گھنٹوں میں کرنے لگا۔لوگوں کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ایسا بھی ممکن ہے۔جن لوگوں کے کھیت سڑکوں کے کنارے تھے اور جہاں ٹریکٹر کے لیے آسانی سے راستہ بنایا جا سکتا تھا؛ وہاں اس سال ہل بھی ٹریکٹر کے ذریعے چلائے گئے۔بیلوں کے ذریعے جو کھیت بمشکل دو دنوں میں بیجا جا سکتا تھا ٹریکٹر نے اسے ایک آدھ گھنٹے ہی میں بیجنا شروع کر دیا۔

اسی سال مکئی کی کٹائی سے پہلے ہی لوگوں نے اپنے اپنے کھیتوں اور کھلیانوں تک راستے بنانے شروع کر دیے تاکہ ٹریکٹر کے ذریعے زمین بیجی جا سکے۔مکئی کٹتے ہی ٹریکٹر اپنے ساتھ مکئی کوٹنے کی ایک چھوٹی سے مشین لیے گاؤں میں داخل ہوا اور اگلے اڑتالیس گھنٹوں کے اندر اندر گاؤں کی ساری مکئی، جسے کوٹتے ہوئے عام طور پر بیس پچیس دن لگ جاتے تھے، کوٹ کر کھیتوں میں ہل چلانے لگا۔اس سال بیلوں کے ذریعے صرف انھی کھیتوں میں ہل چلائی گئی جن تک راستہ نہیں بنایا جا سکا تھا۔یوں اگلے دو ہی سالوں میں لوگوں نے اپنے بیل بھی، جو پہلے ہر گھر کا لازمی جزو ہوتے تھے، بیچ ڈالے۔

لوگ بہت خوش تھے کہ اب وہ سہولت سے کاشت کر سکیں گے اور اس کام کے لیے نہ صرف سال بھر بیلوں کو مفت میں کھلانا نہیں پڑے گا بلکہ ہل چلانے، گندم گاہنے اور مکئی کوٹنے جیسے مشقت طلب کاموں سے بھی جان چھوٹ گئی ہے۔بیل تو پورے گاؤں سے یوں غائب ہوئے کہ دو تین ہی سال بعد گائیوں کو ملاپ کے لیے دوسرے گاؤں لے جانے کی ضرورت پیش آنے لگی۔پھر گاؤں کے ایک شخص نے دو تین بیل پال لیے جو مزے سے کھاتے پیتے اور صرف اور صرف افزائش نسل کا فریضہ سر انجام دینے لگے اور ان کا مالک گائیوں کے مالکان سے اس کام کا بھی معاوضہ طلب کرنے لگا۔

ٹریکٹر اور اس سے وابستہ مشینوں نے آدمی کو پہلے زمین کی اور بالآخر آپس کی جڑت

سے آزاد کر دیا۔ اب ہر آدمی آزاد اور خود مختار تھا۔ وہ جب چاہتا ٹریکٹر والے کو بلوا کر زمین بیج ڈالتا اور جب چاہتا تھریشر کے ذریعے دانے اور بھوسا الگ کروالیتا۔ یہ خود مختاری غیر محسوس طریقے سے لوگوں کی رگوں میں دوڑنے لگی اور لوگ ایک دوسرے سے کٹتے چلے گئے۔ اگلے چند ہی سالوں میں شادی بیاہ اور ماتم وغیرہ کے لیے برتن بھی، جو پہلے تمام گاؤں والوں کے گھروں سے اکٹھے کیے جاتے تھے، ٹینٹ سروس کی دکانوں سے آنے لگے اور قبریں مزدوری پر کھودی جانے لگیں۔

سو اس کے بعد مجھے بھی سوائے شادی بیاہ اور ماتم کے گاؤں میں جانے کی ضرورت نہیں رہی اور میرا زیادہ تر وقت جندر پر دانے پیسنے اور کتابیں پڑھنے میں صرف ہونے لگا۔

❖❖❖❖

## ۱۵

زندگی کے ہزار رنگ ہیں مگر موت کا ایک ہی رنگ ہے؛ سیاہ رنگ، جو زندگی کے تمام رنگوں کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ مجھے زندگی کے رنگوں کا شعور بعد میں ہوا۔ میں نے موت کے سیاہ رنگ کا شعور پہلے حاصل کیا۔

میری عمر اس وقت تقریباً پانچ سال کے لگ بھگ ہوئی ہوگی۔تب میں زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں جندر کے صحن میں کھیل رہا تھا کہ سامنے والے ڈاک ٹیلے پر کھڑے ہو کر کسی نے میرے باپ کو پکارا اور میرا باپ باہر پڑی چونگیں جندر کے کمرے میں رکھ کر جندر بار نے لگا۔ پھر وہ مجھے ساتھ لے کر گاؤں آ گیا۔

جب میں اپنے باپ کے ساتھ چچا کے گھر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہاں بہت سے لوگ جمع ہیں۔ خواتین رو رہیں ہیں جب کہ مرد صحن کے ایک کونے میں جم گھٹا بنائے کھڑے ہیں۔ میں نے لوگوں کے بیچ میں گھس کر دیکھا تو سامنے میرا چچا زاد بھائی عارف، جو مجھ سے ایک سال بڑا تھا، لکڑی کے ایک تختے پر سویا پڑا ہے اور لوگ؛ جن میں سے زیادہ تر میرے رشتہ دار تھے ،اسے نہلا رہے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ سر پر پانی ڈالنے کے باوجود وہ نہ تو آنکھیں کھول رہا ہے اور نہ ہی ہاتھ پاؤں ہلا جلا رہا ہے۔ حالاں کہ جب میرا باپ مجھے نہلاتا تھا تو میرا سانس رک جاتا تھا اور میں رونا شروع کر دیتا تھا۔

میں کچھ دیر اس منظر کو تجسس اور حیرت کی نظر سے دیکھتا رہا تھا۔ پھر کسی نے مجھے بازو

سے پکڑ کر وہاں سے پرے ہٹا دیا اور میں صحن کے دوسرے کونے میں جا کر اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیلنے لگا۔ کھیل کے دوران میں بھی میرا دھیان ایک دو مرتبہ اس کے بے حس و حرکت وجود کی طرف گیا لیکن پھر جلد ہی میں بھول گیا۔

سہ پہر کے وقت جب لوگ اسے سفید کپڑے میں لپیٹ کر قبرستان کی طرف جانے لگے، جو چچا کے گھر کے بالکل قریب تھا، تو میں بھی ان کے ساتھ چل پڑا۔ قبرستان پہنچ کر انھوں نے اسے ایک چھوٹی سی چٹائی پر رکھا اور سب لوگ صفیں باندھ کر نماز پڑھنے لگے جب کہ میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ اس گڑھے کو حیرت سے دیکھنے لگا جس کے اندر دیواریں اساری جا چکی تھیں۔ میری حیرت میں خوف کا عنصر اس وقت شامل ہوا جب لوگ اسے گڑھے میں اتار کر اس کی دیواروں پر تختے رکھنے لگے۔ جب مٹی ڈالنے کی باری آئی تو میں خوف زدہ ہو کر اپنے باپ سے، جو اس وقت مٹی ڈالنے والے لوگوں میں شامل تھا، لپٹ گیا اور اس نے بیلچہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں تھما کر مجھے اٹھا لیا تھا۔

''نہیں بیٹا۔ جو لوگ مر جاتے ہیں ناں۔ وہ کھانا نہیں کھاتے۔'' میرے باپ نے خالی خالی نظروں سے چھت میں گھورتے ہوئے اس وقت کہا تھا، جب عارف کی موت کی رات وہ مجھے اپنے ساتھ چارپائی پر لٹا کر سلانے کی کوشش کر رہا تھا اور میں نے یک دم سوال کر دیا تھا کہ ''ابا عارف بھائی پر تو لوگوں نے مٹی ڈال دی ہے اب وہ کھانا کیسے کھائے گا۔'' باپ کی طرف سے ملنے والے اس جواب نے مجھے اور بھی متجسس کر دیا تھا اور میرا چھوٹا سا دماغ ساری رات اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ پھر وہ قبر میں بھوکا کیسے سوئے گا۔

ممکن ہے اگر مرنے والا عارف کی جگہ کوئی اور ہوتا تو موت کے بارے میں میرا تجسس زیادہ نہ ہوتا۔ لیکن وہ چوں کہ ہر تیسرے چوتھے دن چچا کے ساتھ جندر پر آ جایا کرتا تھا اور میرے ساتھ کھیلتا رہتا تھا اور ہمارے درمیان ایک انسیت کا رشتہ بھی تھا اس لیے اس کی موت نے میرے دماغ پر گہرا اثر چھوڑا۔ میں کئی دن تک اس کے بارے میں متواتر سوچتا رہا اور ایک دن جب میں

نے اپنے باپ سے پوچھا کہ "ابا کیا میں بھی مر جاؤں گا؟" تو اس نے مجھے سینے سے لگا کر یوں بھینچا جیسے وہ مجھے موت کے پنجے سے چھڑا رہا ہو اور صرف اتنا کہہ پایا تھا کہ "خدا نہ کرے۔" اور میں موت سے زیادہ خدا کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

اس واقع کو پینسٹھ سال گزر چکے ہیں اور میں خدا اور موت دونوں کے بارے میں آج بھی اتنا ہی متجسس ہوں جتنا کہ پانچ سال کی عمر میں تھا۔ یہ بات اسی دن سے میرے لاشعور میں کہیں بیٹھ گئی کہ خدا اور موت کے درمیان کوئی گہرا رشتہ ہے لیکن میں اس گتھی کو آج تک نہیں سلجھا سکا کہ خدا نے موت کو خلق کیا یا موت نے خدا کو۔

خدا کے وجود سے انکار کرنے والے تو آج بھی دنیا میں بے شمار موجود ہیں مگر شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا باشعور انسان ہو جو موت کے وجود سے انکاری ہو۔ موت پر سب کا ایمان ہے۔ ہر باشعور انسان کو موت کا بھی اتنا ہی یقین ہوتا ہے جتنا کہ زندگی کا، لیکن وہ اس سے صرف نظر کر کے خود کو محفوظ سمجھتا رہتا ہے؛ جیسے کبوتر بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اب وہ اس کے خوں خوار پنجوں کی پہنچ سے دور ہے۔ میں نے پانچ سال کی عمر کے بعد خود کو کبھی موت کی پہنچ سے دور نہیں سمجھا لیکن اسے کبھی اتنا قریب بھی نہیں پایا جتنا گزشتہ پینتالیس دنوں سے پا رہا ہوں؛ اور اب گزشتہ شام سے تو میں اسے دنیا کی ہر شے سے حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی زیادہ نزدیک محسوس کر رہا ہوں۔

میں نے ہمیشہ یہی سنا ہے کہ موت آتی ہے تو انسان مر جاتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں موت کہیں باہر سے وارد نہیں ہوتی وہ زندگی کی سرشت میں شامل ہوتی ہے۔ جوں ہی کسی وجود میں زندگی ترتیب پاتی ہے، موت بھی اس میں پناہ حاصل کر لیتی ہے اور زندگی کو اس وجود سے باہر دھکیلنے کا عمل شروع کر دیتی ہے۔ جس وجود کی زندگی جتنی طاقت ور ہوتی ہے وہ اتنے ہی طویل عرصے تک وہاں قدم جمائے رکھتی ہے مگر کب تک؛ آخری فتح تو موت ہی کی ہوتی ہے۔

یہ میری موت، جو، اب میری زندگی پر فتح پانے والی ہے، اس نے اپنی کوششوں کا آغاز اسی وقت کر دیا تھا جب میں نے پہلا سانس لیا تھا۔ یوں میرا پہلا سانس اپنی موت کی طرف میرا پہلا قدم بھی تھا۔ شاید میری موت کو ابھی پندرہ بیس سال مزید تگ و دو کرنا پڑتی لیکن میرے بیٹے نے نہ صرف اس کا کام آسان بنا دیا بلکہ ایک تہذیب کے انہدام میں بھی اپنا حصہ ڈال دیا۔

❖❖❖❖

۱۶

میرا یہاں اس طرح مرنا صرف ایک انسان کی نہیں، ایک تہذیب کی موت ہے۔ وہ تہذیب جس کی بنیاد انسان نے ہزاروں سال پہلے اس وقت رکھی تھی جب دنیا کے پہلے انسان نے بہتے پانی کی قوت کا اندازہ لگایا۔ جس طرح حضرت نوحؑ کا پیش رو، جس نے سب سے پہلے ہوا کی طاقت کا اندازہ لگا کر دنیا کی پہلی بادبانی کشتی تیار کی تھی، یقیناً کسی ساحلی علاقے کا باسی تھا، اسی طرح پانی کی طاقت کا اندازہ لگانے والا پہلا شخص میری طرح کوئی پہاڑیا ہی ہوا ہوگا؛ جو مال مویشی چرانے کسی جنگلی چراگاہ میں جاتا رہا ہوگا جہاں کسی پہاڑی آبشار سے پانی پیتے ہوئے اس پر پانی کی قوت کا راز منکشف ہوا ہوگا۔ جوں ہی اس نے پانی پینے کے لیے اوک پانی کی دھار کے نیچے رکھی ہوگی اور پانی نے اسے زور سے دھکیلا ہوگا اس پر پانی کی قوت کا راز منکشف ہوگیا ہوگا۔ وہ کئی دن تک اس بارے غور فکر کرتا رہا ہوگا اور پھر اس نے اسی آبشار کے کنارے موجود جنگلی انار کے درخت سے انار توڑ کر اس کے پیٹ میں انار ہی کے آٹھ دس موٹے کانٹے کھبو کر اور ایک پتلی لکڑی اس کے آرپار کر کے اسے ایک دوسری لکڑ میں یوں پیوست کر لیا ہوگا کہ حرکت دینے پر وہ گھوم سکے۔ یوں ایک کھلونا بنا کر وہ ایک عرصے تک اس سے کھیلتا رہا ہوگا۔

ایک دن جب اس کی ماں یا بیوی جس کے ذمے دانے پیسنے کی ذمہ داری رہی ہوگی، بیمار پڑی ہوگی اور اسے خود ہتھ چکی چلانا پڑی ہوگی تو چکی چلاتے ہوئے جب اسے پورا زور لگانا پڑ رہا ہوگا تو اس کے ذہن میں ایک ایسی چکی کا تصور ابھرا ہوگا جسے چلانے کے لیے انسانی ہاتھوں کی

قوت درکار نہ ہو۔اس معاملے پر سوچتے سوچتے معاً اسے اس کھلونا جندر کا خیال آیا ہوگا، جس سے وہ ایک عرصے تک کھیلتا رہا ہوگا۔

اس نے اس منصوبے پر عمل درآمد کے لیے اپنے خاندان یا قبیلے کے سیانوں سے مشورہ کیا ہوگا، جسے سب نے مسترد کر دیا ہوگا کہ ان کا ذہن کسی ایسی حرکت کا تصور ہی نہیں کر سکتا ہوگا جو کسی انسان یا جانور کی طاقت کے بغیر عمل میں لائی جا سکے۔لیکن وہ میری بیوی کی طرح اپنی ہٹ کا پکا ہوا ہوگا، اور اس نے تنہا ہی اپنی کوششیں جاری رکھنے کا عزم کیا ہوگا۔ممکن ہے ایک آدھ آدمی کو اس نے اپنا ہم نوا بھی بنا لیا ہو، جس نے اس منصوبے کی تکمیل میں اسے مدد دی ہو۔

وہ کئی دن تک کسی آبشار کے کنارے بیٹھا اپنے ذہن میں اس منصوبے کا خاکہ تیار کرتا رہا ہوگا۔پھر اس نے اپنے ذہن میں موجود جندر کے اس نقشے کو، پتھر ہی کے قلم سے ایک سلیٹ نما پتھر پر اتارا ہوگا۔پھر اسی آبشار کے کنارے کھڑے کسی درخت کو کاٹ کر اس کے موٹے تنے سے فٹ بھر ٹکڑا علاحدہ کر کے اسے یوں تراشا ہوگا کہ وہ دور سے دیکھنے پر ایک بڑا انار ہی نظر آئے، باقی تنے سے اس نے دو درجن کے قریب ہتھیلی بھر چوڑی لکڑی کی پھٹیاں تراشی ہوں گی اور انار نما تنے میں تھوڑے ترچھے سوراخ کر کے انھیں اس میں ٹھونک دیا ہوگا، پھر اس نے اسی درخت کی کسی سیدھی شاخ سے ایک مضبوط دستہ تراش کر اسے اس کے اوپر والے سرے میں ٹھونک دیا ہوگا، یوں ویسا ہی یا اس سے ملتا جلتا ایک چرخا تیار ہو گیا ہوگا جیسا اس وقت میرے اس جندر کے نیچے گھوم رہا ہے۔

اگلے مرحلے میں اس نے پتھر کے دو ویسے ہی پاٹ تراشے ہوں گے، جیسے اس کے گھر میں پہلے سے موجود ہوں گے۔پھر اس نے ایک ایسی جگہ کمرہ تیار کیا ہوگا جہاں سے وہ ندی کا پانی موڑ کر ایک خاص بلندی پر سے لکڑی کے ایک عمودی پرنالے کے ذریعے گرا سکے۔اس پرنالے کے آگے جہاں پانی گر رہا ہوگا، اس نے لکڑی کا ایک بھاری تختہ، جس کے وسط میں اس نے پہلے ہی سوراخ کر رکھا ہوگا، بچھایا ہوگا اور پھر اس سوراخ میں چرخے کا نیچے والا سرا یوں پیوست کیا ہوگا

کہ جب پانی اس کے گرد لگی لکڑی کی پھٹیوں کو دھکیلے تو وہ آسانی سے اپنے محور پر گھوم سکے۔ اس چرخے کے عین اوپر کمرے کے فرش پر اس نے پتھر کے تراشے گئے دو پاٹوں میں سے ایک زمین میں نصب کیا ہوگا اور چرخے کے دستے کا اوپر والا سرا اس کے سوراخ میں سے گزار کر اس کے اوپر لکڑی یا لوہے (اگر اسے لوہا دستیاب تھا) کی ایک ٹی نصب کی ہوگی اور پھر اس کے ناپ کے مطابق اوپر والے پاٹ کو چھینی سے کھرچ کر اس میں یوں فٹ کر دی ہوگی کہ جب چرخا گھومے تو اوپر والا پاٹ بھی اس کے ساتھ گھومنے لگے۔

اس کام کی تکمیل کے بعد اس نے پتھر کا ایک بڑا کھارا تراشا ہوگا اور پاٹوں کے پیچھے ایک اونچا تھلا بنا کر، اسے اس کے اوپر نصب کر دیا ہوگا پھر اس کے وسط میں سوراخ کر کے، لکڑی کی نالی کے ذریعے اسے ان پاٹوں کے وسط میں بنائے گئے سوراخ سے یوں ملا دیا ہوگا کہ اگر کھارے میں دانے انڈیلے جائیں تو وہ آہستہ آہستہ سرکتے ہوئے پاٹوں کے درمیان گرنے لگیں۔ یہ سب کر چکنے کے بعد جب اس نے پانی موڑ کر پرنالے کے ذریعے جندر میں گرایا ہوگا اور وادی پہلی دفعہ جندر کی کوک سے آشنا ہوئی ہوگی تو جندروئی تہذیب کا آغاز ہوا ہوگا۔ جندر نے ہزاروں سال انسان کا ساتھ دیا اور اس کی تمدنی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ پانی سے بجلی پیدا کرنے کا خیال بھی انسان کو یقیناً جندر ہی نے بخشا۔ مجھے تو یقین ہے کہ پن بجلی کا پہلا تجربہ کرنے والا سائنس دان یا تو کسی جندروئی کا بیٹا تھا یا اس کا کوئی رشتہ دار۔ ہزاروں سال تک انسان کا ساتھ نبھانے والی جندروئی تہذیب اب آہستہ آہستہ اپنے انجام کو پہنچ رہی ہے اور میرے اور میرے اس جندر کی تباہی کے بعد اس میں مزید تیزی آ جائے گی۔ کچھ علاقوں میں جو جندر ابھی چل رہے ہیں وہ بھی اگلے کچھ سالوں میں کھنڈر ہو جائیں گے کہ جندر ہی کی کوکھ سے پیدا ہونے والی پن بجلی سے چلنے والی چکیاں اب ہر گاؤں میں نصب ہونے لگی ہیں۔

❖❖❖❖

۱۷

میری عمر اس وقت تقریباً اتنی ہی ہے جتنی میری پیدائش کے وقت بابا جمال دین کی تھی۔ میں شاید بابا جمال دین جتنا تو نہ جی سکتا لیکن اس کے باوجود میں دس برس تو مزید گزار ہی لیتا، اگر میرے جندر کو اس کا دانہ پانی ملتا رہتا اور اس کی سریلی کوک برقرار رہتی۔

سات سال پہلے جب میرا بیٹا راحیل گاؤں کی مسجد کے خادم کو بجلی سے چلنے والی آٹا مشین لگانے کے لیے مالی معاونت فراہم کر رہا تھا تو اس کے سان گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ وہ ایک تہذیب کے انہدام میں حصہ ڈالنے کے ساتھ ساتھ، اپنے باپ کی موت کا بھی سامان کر رہا ہے۔ وہ تو اس بات سے بھی بالکل بے خبر ہے ______ اور میری موت کے بعد ہمیشہ بے خبر ہی رہے گا ______ کہ اس کی ماں نے، شادی سے پہلے، اپنے ذہن میں میری شخصیت کا جو تصور قائم کر رکھا تھا، شادی کے بعد، میں اس سے سراسر مختلف نکلا۔ اس نے مجھے ایک بہادر، آزاد اور دنیا سے بے نیاز آدمی سمجھ کر، مجھ سے شادی کی تھی اور پھر جیسے ہی اسے پتا چلا کہ میں اتنا بز دل اور مجبور آدمی ہوں کہ جندر کی سریلی کوک کے بغیر سو بھی نہیں سکتا تو اس نے پہلے جذباتی اور پھر ایک ناقابل توضیح اور مبہم انداز میں، مجھ سے علاحدگی اختیار کر لی تھی۔ میرے رشتہ داروں سمیت، تمام گاؤں والے اس بات پر حیران تھے ______ اور حیران نہ ہونے کی ان کے پاس کوئی وجہ بھی نہیں تھی ______ کہ ایک ایسا رشتہ جسے اس نے اپنی مرضی، بل کہ اپنے والدین خاص کر والدہ سے ضد کر کے استوار کیا تھا، اتنی آسانی سے کیوں اور کیسے توڑ لیا؛ اور وہ بھی سال سوا سال کے مختصر

عرصے میں، بغیر کسی وجہ کے۔ گاؤں والے حتیٰ کہ اس کے والدین اور بھائی بھی کبھی اس کی وجہ نہیں جان سکے۔

میں ایک عرصے تک یہی سمجھتا رہا کہ اس نے بعد میں راحیل کو ہماری علاحدگی کی وجوہات سے آگاہ کر دیا ہوگا۔ آخر شعور کی عمر میں قدم رکھنے کے بعد اس نے کبھی تو یہ سوال اٹھایا ہی ہوگا کہ طلاق نہ ہونے کے باوجود آپ دونوں ایک دوسرے سے علاحدہ کیوں رہ رہے ہیں۔ لیکن بہت عرصے بعد مجھ پر کھلا کہ اس نے یہ راز ہمیشہ کے لیے اپنے سینے میں دفن کر دیا تھا اور اس کی وجہ اس کا میرے بارے میں کہا ہوا وہ جملہ ہوگا جو ہماری شادی سے پہلے زبان زد خاص و عام تھا کہ مرد ہو تو ولی خان جیسا؛ بہادر، آزاد اور بے نیاز۔

میری طرف سے اس انکشاف کے بعد کہ میری زندگی جندر کے پاٹوں کی سریلی گونج سے بندھی ہوئی ہے، اسے سخت مایوسی ہوئی ہوگی۔ اس کے ذہن میں میری شخصیت کے بارے میں موجود تصور کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ وہ ایک مثالیت پسند خاتون تھی۔ اس نے مجھ سے نہیں اس تصور سے شادی کی تھی، جو میرے بارے میں اس نے اپنے ذہن میں قائم کر رکھا تھا اور اس تصور کے ٹوٹنے کے بعد میرے ساتھ اس کا رہنا ناممکن ہو گیا تھا۔ پھر جب میں نے اسے گھر واپس لانے کے لیے جندر چھوڑ کر لکڑی کا ٹال لگا لیا تھا تو اس نے اس امید کے ساتھ واپس میرے گھر میں قدم رکھا تھا کہ شاید میں خود کو اس کے تصور کے مطابق ڈھال سکوں، لیکن میں کوشش کے باوجود اس میں ناکام رہا۔ اگر اس دوران میں، راحیل پیدا نہ ہوتا تو شاید میں اپنی کوششیں جاری رکھتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ میں اس میں کامیاب بھی ہو جاتا؛ جیسا کہ اس کا خیال تھا اور جس کا اظہار، مجھے حوصلہ دینے کے انداز میں، وہ کئی بار کر چکی تھی۔ وہ راحیل ہی تھا جس کی پیدائش نے میرے دماغ میں یہ بات انڈیلی کہ اب اس کے قدموں میں بھی ایک بچے کی بیڑی ڈل چکی ہے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ ایسی کسی بیڑی کو خاطر میں نہیں لائے گی؛ اس وقت بھی، جب میں اپنے بدن کو اس کا لباس کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس کے بدن کی، ایک رات کی یخ بستگی نے، ہمارے درمیان سرد

مہری کی ایک ایسی دیوار کھڑی کردی، جسے گرانے میں، میں کبھی کامیاب نہ ہوسکا۔

میں اس بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا کہ جب راحیل اس سے ہماری علاحدگی کی وجہ دریافت کرتا رہا ہوگا تو وہ اسے کیا جواب دیتی رہی ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ اس نے کسی بھی موقع پر اسے میرے خلاف نہیں اکسایا ہوگا کہ میٹرک کرنے تک وہ میرے پاس جندر پر ہر دوسرے تیسرے روز آتا جاتا رہا۔ ان دنوں وہ جوان ہو چکا تھا لیکن اس نے میرے سامنے یہ سوال کبھی نہیں اٹھایا۔ بعد میں وہ مزید تعلیم حاصل کرنے شہر چلا گیا اور اس دوران میں بھی وہ جب بھی گاؤں آتا مجھے ملنے ضرور آتا۔ میں نے اس کے مزاج میں تبدیلی افسر بن جانے کے بعد محسوس کی اور پھر شادی کے بعد اس کا میرے ساتھ رویہ یک دم تبدیل ہو گیا تھا۔

میں نے جو کچھ کہانیوں سے سیکھا اس کی بنیاد پر میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ہماری علاحدگی کے سلسلے میں، شروع ہی سے مجھے ہی قصوروار سمجھتا رہا ہوگا اور پھر لاشعوری طور پر مجھ سے نفرت کرنے لگا ہوگا یہ نفرت اس رقابت سے سراسر مختلف رہی ہوگی جسے فرائیڈ نے ایڈی پس کمپلکس کا نام دیا تھا۔ وہ تو اس بات کا کبھی تصور بھی نہیں کر سکا ہوگا کہ اس کی ماں نے مجھ سے محض اس لیے علاحدگی اختیار کر لی تھی کہ مجھے جندر کی کوک سنے بغیر نیند نہیں آتی۔ اگر ہم دونوں میں سے کوئی، اس کے لڑکپن ہی میں، اسے علاحدگی کی وجہ بتا دیتا تو آج وہ یقیناً ایک مختلف شخص ہوتا؛ اور نہیں تو کم از کم میری شخصیت کے بارے میں اس کا تصور لازماً مختلف ہوتا اور اس کے دل میں میرے خلاف نفرت کے بجائے ترحم کے جذبات ابھرتے۔ بے شک افسر بننے کے بعد اسے یہ گوارا نہ ہوتا کہ اس کا باپ جندر پر بیٹھ کر اس کی رسوائی کا سامان کرے لیکن اس کا رویہ ویسا نہ ہوتا جیسا کہ ہے۔ اگر اس کی بیوی اصرار بھی کرتی تو وہ یہ کہہ کر اس کا منہ بند کرا دیتا کہ میرے باپ کی زندگی اسی جندر سے جڑی ہوئی ہے اب میں اسے مار تو نہیں سکتا۔

اپنی نوجوانی کے دنوں میں جب وہ میرے ہاں آتا اور مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کیا کرتا تھا تو کئی دفعہ میں نے سوچا کہ اسے اپنی مجبوری سے آگاہ کر کے اپنا دامن صاف کر لوں لیکن

میں پھر یہ سوچ کر اپنے ارادے سے باز رہا کہ ممکن ہے وہ اپنی ماں کے بارے میں بدگمان ہو جائے اور یوں میں اس خاموش مفاہمت کی خلاف ورزی کر بیٹھوں جو علاحدگی کے پہلے ہی دن سے ہمارے درمیان جاری تھی۔

مجھے یہ بات گوارا نہیں تھی کہ وہ اپنی ماں کو قصوروار ٹھہرائے۔ اسے اب تک اسی نے پالا پوسا اور لکھایا پڑھایا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ اس کی پرورش مجھ سے بہتر طور پر کر رہی ہے اگر وہ میرے ساتھ رہتا تو میں اسے کبھی اتنی توجہ نہ دے سکتا اور آج وہ اتنا بڑا افسر کبھی نہ بن سکتا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب سلیکشن کے بعد وہ مجھے ملنے آیا تھا تو اس نے یہیں اسی تھلے پر بیٹھ کر کہا تھا کہ مجھے شہر میں ایک بہت اچھی ملازمت مل گئی ہے اب آپ کو جندر پر بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔ یا تو اسے بار دیں یا پھر کسی اور کے حوالے کر کے گھر میں آرام کریں۔ میں خاموش رہا تھا، ظاہر ہے میں جندر چھوڑ تو نہیں سکتا تھا لیکن اپنے بیٹے کے منہ سے یہ سب سن کر خوش ضرور ہوا تھا۔

کچھ ماہ بعد جب وہ دوبارہ مجھے ملنے آیا تو اس کے رویے میں خاصی تبدیلی آ چکی تھی۔ اب کی بار اس کے لہجے میں ایک افسر بول رہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ خدارا میری عزت کا خیال کریں۔ اب یہ سب چھوڑیں اور گھر بیٹھ کر اللہ اللہ کریں۔ مجھے اس کے اس رویے سے بہت صدمہ پہنچا تھا اور وہ خوشی جو پچھلی ملاقات میں، اس کی باتوں سے مجھے ملی تھی، زائل ہو گئی تھی۔

اس کے بعد وہ جب بھی مجھے ملنے آیا اس کا رویہ ایسا ہی تھا۔ وہ باتوں باتوں میں مجھ پر واضح کر دیتا کہ اسے میرا اس طرح جندر سے چمٹے رہنا ہرگز گوارا نہیں۔ اس کے رویے میں مزید تبدیلی شادی کے فوراً بعد دیکھنے میں آئی۔ کئی دفعہ میں نے اندازہ لگایا کہ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ مجھے زبردستی یہاں سے اٹھا کر ساتھ لے جاتا لیکن ایسی صورت میں وہ گاؤں والوں کو کیا منہ دکھاتا۔ چناں چہ اس نے گاؤں کی مسجد کے خادم کو بجلی سے چلنے والی آٹا مشین لگا کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ اسے معلوم تھا کہ ارد گرد کے دیہات میں پہلے سے آٹا مشینیں چل رہی ہیں اور صرف

ہمارے ہی گاؤں کے لوگ اب ابا کے جندر پر آٹا پسوانے جاتے ہیں۔ جب ان لوگوں کو یہ سہولت گاؤں ہی میں دستیاب ہو جائے گی تو کوئی ادھر کا رخ نہیں کرے گا یوں اس کے باپ کے پاس جندر ہارنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا۔

مسجد کا خادم، جو ایک حد تک اس کا بھی خادم تھا کہ گاؤں میں موجود اس کے گھر بار کی دیکھ بھال بھی اسی کے ذمے تھی، ایک غریب آدمی تھا جس کا بیٹا شہر میں کوئی چھوٹی موٹی ملازمت کرتا تھا۔ راحیل نے اسے اعتماد میں لے کر چکی پر اٹھنے والے اخراجات اس کے بیٹے کے حوالے کیے تا کہ کسی کو شک نہ گزرے کہ اس کے پیچھے اس کا ہاتھ ہے۔ چند ہی دنوں میں وہ شہر سے بجلی سے چلنے والی آٹا چکی لے آیا اور جامع مسجد کی کرائے پر اٹھائی جانے والی دکانوں میں سے ایک دکان جو، پچھلے کچھ عرصے سے مسجد کے اضافی سامان کے لیے ایک طرح کے سٹور کا کام دے رہی تھی، کرائے پر لے کر اس میں نصب کر لی۔

جامع مسجد گاؤں کے عین وسط میں واقع ہے اور اس کے چاروں محلے اس کے چوگرد پھیلے ہوئے ہیں۔ چوں کہ گاؤں کا مرکزی بازار بھی وہیں ہے اور لوگ سودا سلف لینے بھی وہیں جاتے ہیں اس لیے چکی کی تنصیب کے لیے اس جگہ کا انتخاب کرتے ہوئے میرے بیٹے کے پیش نظر یہ بات ضرور رہی ہوگی کہ ایسی صورت میں انھیں آٹا پسوانے کے لیے بطور خاص کہیں اور نہیں جانا پڑا کرے گا۔ جب بھی کوئی آدمی بازار میں سودا سلف خریدنے نکلا کرے گا، جاتے ہوئے ایک چونگ بھی کاندھے پر رکھ کر لے جایا کرے گا۔ جب کہ میرے جندر پر آٹا پسوانے انھیں بطور خاص آنا پڑتا تھا اور وہ بھی اتنی دور؛ ایک دشوار گزار ڈھلوانی راستہ اتر کر۔ واپسی پر تو انھیں آٹا اٹھا کر میل بھر چڑھائی بھی چڑھنا پڑتی تھی اور بیشتر لوگوں کا سانس پھول جاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھی پہلے پہل بہت سے لوگوں نے میرے جندر سے رشتہ نہیں توڑا۔

ان میں سے کچھ تو ایسے تھے جو مروتاً میرے پاس آٹا پسوانے آتے تھے اور پرانی لاج نبھاتے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو سمجھتے تھے کہ مشین سے پسوائے گئے آٹے میں سواد نہیں

ہوتا۔خاص کر بوڑھے بزرگ جو مجھ سے بڑے یا میرے ہم عمر تھے؛انھیں تو مشین سے پسوائے گئے آٹے کی روٹی کا بالکل ہی سواد نہیں آتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ چار پانچ سال تک تو اتنے دانے میرے جندر پر بھی آہی جاتے تھے کہ کم از کم رات بھر جندر کی سریلی کوک ندی کے شور کرتے پانی پر تیرتی رہتی اور مجھ سمیت یہاں کی ہر چیز خوشی سے جھومتی رہتی۔پھر آہستہ آہستہ ان میں کمی آتی گئی اور میں نے بھی معمول بنالیا کہ صرف سوتے وقت انھیں کھارے میں انڈیلتا تاکہ جندر کو نجتا رہے اور تین چار گھنٹے میری آنکھ لگی رہے۔پھر جیسے ہی دانے ختم ہوتے اور جندر کی خوشگوار آواز ایک ہوک میں تبدیل ہوتی،میں جاگ جاتا۔اگر دوسری چونگ موجود ہوتی تو اسے کھارے میں انڈیل دیتا اور دوبارہ سو جاتا؛نہیں تو اسی نیند کو غنیمت سمجھ کر خدا کا شکر ادا کرتا۔لیکن جیسے جیسے چونگیں آنا کم ہوتی گئیں میری نیند بھی کم ہوتی گئی،اس دوران میں،کبھی کبھار ایک دو دنوں کا وقفہ بھی آجاتا اور بارہا ایسا بھی ہوا کہ میں مسلسل ستر بہتر گھنٹے تک بھی جاگتا رہا لیکن پھر جیسے ہی کوئی چونگ اٹھائے جندر کا رخ کرتا میں انھیں کھارے میں انڈیل کر،بھاگتا ہوا جندر کے پچھواڑے جاتا اور آدھا پانی موڑ کر جندر کو ہلکی رفتار سے چلا کر یہیں تھلے پر سو جاتا۔لیکن اب گذشتہ پینتالیس دنوں سے تو میں تقریباً جاگ ہی رہا ہوں کہ کسی نے بھی ادھر کا رخ نہیں کیا۔شاید اب بوڑھے بھی مشینی آٹے کی روٹی کے عادی ہو چکے ہیں۔

میری معدوم ہوتی یادداشت میں، پینتالیس دن پہلے کا وہ لمحہ اب بھی پوری طرح نقش ہے، جب چونگ پیس کر جندر کی کیل اٹھاتے ہوئے میرے ذہن میں یہ خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا تھا کہ میں اپنی اور جندر کی زندگی کی آخری چونگ پیس چکا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جب قیامت کے دن مجھے اٹھایا جائے گا تو میری یادداشت میں سب سے پہلے یہی منظر ابھرے گا۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہم جب کسی فوت شدہ عزیز کا چہرہ دیکھتے ہیں تو وہ ہمارے ذہن پر یوں نقش ہو جاتا ہے کہ اس سے متعلق باقی یادوں کو تقریباً مٹا کر رکھ دیتا ہے۔ حالاں کہ ہم نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اس کے ساتھ بسر کر رکھا ہوتا ہے اور اس سے وابستہ بے شمار یادیں ہمارے شعور اور لاشعور میں موجود ہوتی ہیں لیکن جوں ہی ہم اس کے بارے میں سوچتے ہیں ہماری یادداشت میں سب سے پہلے اس کا مردہ چہرہ ہی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ میں نے جب بھی اپنے باپ بابا جمال دین کے بارے میں سوچا، جو دنیا میں مجھے سب سے زیادہ عزیز تھے، ان کا مردہ چہرہ ہی میری یادداشت میں ابھرا۔ اس کے برعکس بے شمار ایسے لوگ جو مر کھپ چکے ہیں، جن میں میری مرحومہ بیوی بھی شامل ہے، اور میں کسی وجہ سے ان کی موت کے موقع پر، ان کا آخری دیدار نہیں کر سکا، آج بھی جب مجھے یاد آتے ہیں تو ان کا زندہ چہرہ ہی میرے سامنے آتا ہے۔ اس بات کا احساس مجھے بہت پہلے ہی ہو گیا تھا یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی مجبوری لاحق نہ ہوتی تو میں عموماً اپنے مرے ہوئے عزیزوں کا آخری دیدار نہیں کرتا تھا یوں اپنی یادداشت میں ان کا زندہ چہرہ ہی محفوظ کر لیتا تھا۔ لیکن جندر کے معاملے میں، میں ایسا نہیں کر سکا۔ اس کی وہ سریلی گونج، جس کا میں ساری

زندگی اسیر رہا، اب کافی غور کرنے کے بعد مجھے یاد آتی ہے ۔جوں ہی میرا دھیان اس کی طرف جا تا ہے مجھے وہی منظر یاد آتا ہے جب میں نے آخری چونگ پیس کر جندر کی کیل اُٹھائی تھی اور اس کی سریلی گونج یک دم درد بھری کوک میں تبدیل ہوگئی تھی ۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس خیال کے آتے ہی میں نے پیچھے مڑ کر ایک نظر، دروازے کے اس پار سامنے والی پہاڑی پر ڈالی تھی ،جہاں ڈھلتے ہوئے سورج کی کرنوں نے پیلاہٹ پھیلا رکھی تھی اور مجھے یوں لگا تھا جیسے سورج کوہ مل کے پہاڑوں کے پیچھے نہیں میرے دل میں ڈوب رہا ہے ۔جوں جوں سورج ڈوبتا جارہا تھا اور شام کے سائے گہرے ہورہے تھے، مجھے اپنا وجود پھیلتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ جب سورج کی آخری کرنیں پہاڑی کی چوٹی پر موجود کاہُو کے سب سے بلند و بالا درخت کی آخری پھننگوں پر سے آہستہ آہستہ غائب ہورہی تھیں، مجھے لگا جیسے سورج میرے دل کے کسی نہاں خانے میں گم ہونے کو ہے اور میرے وجود کا سایہ کائنات کی ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے ۔اگلے کچھ ہی لمحوں میں ساری کائنات میرے وجود کے اندھیرے میں گم ہو چکی تھی ۔ میں ساری رات جندر کے رکے ہوئے پاٹ کے سامنے تھلے پر بیٹھا اپنے وجود کی گہرائیوں میں گم ہو چکی کائنات کو ٹٹولتا رہا تھا۔

اگلی صبح سورج مشرقی پہاڑی کی چوٹی سے نہیں میرے معدوم ہوتے وجود کی گہرائیوں سے ابھرا تھا۔جوں ہی کائنات پر سے میرے وجود کا سایہ چھٹا میں اُٹھا اور جندر کے پچھواڑے جا کر لکڑی کا پشتہ جو پرنالے کے اوپر والے سرے میں پیوست تھا کھینچ کر نکالا اور دوسری طرف والی نالی میں گھسیڑ دیا۔جوں ہی پانی کی دھار نے چرخے کو چھوا جندر کی ہوک مجھے پانی کے شور میں بھی سنائی دینے لگی ۔میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا واپس آیا اور جوں ہی جندر کی دہلیز پر قدم رکھا، مجھے لگا جیسے یہ درد بھری ہوک میرے اندر سے اٹھ رہی ہے ۔مجھے ایک درد بھری سرشاری ہوئی ،ویسی ہی سرشاری جیسی خود اذیتی کے شکار لوگوں کو ہوتی ہے لیکن میں اس خود اذیتی سے زیادہ دیر لطف اندوز نہ ہو سکا جلد ہی مجھے جندر کے پچھواڑے جا کر پانی موڑنا پڑا کہ اوپر والے پاٹ کے

ساتھ لکڑی کی وہ کیل جسے کھینچنے سے اوپر والا پاٹ اپنے معمول سے تھوڑا سا اوپر اُٹھ کر نچلے پاٹ سے رگڑ کھائے بغیر گھومتا رہتا ہے، یک دم ٹوٹ گئی اور دونوں پاٹوں کی آپس میں رگڑ کی وجہ سے کمرے میں اتنی گرد اور بو پھیل گئی کہ وہاں ٹکنا محال ہوگیا۔ اس روز میں ساری رات کوئی ایسی صورت نکالنے کے منصوبے بناتا رہا کہ جندر کے دونوں پاٹ آپس میں رگڑ کھائے بغیر مستقل گھومتے رہیں۔

صبح اُٹھ کر میں نے کوہ مل کے دامن میں واقع اس گاؤں کی راہ لی جس کے ایک کچے گھر میں کسی دور میں چچا جان محمد اور اب اس کا بیٹا فضل رہتا ہے۔ فضل اپنے باپ کی طرح جندر کا ماہر کاری گر تھا، اور جن دنوں آٹا پیسنے کا واحد ذریعہ جندر ہی تھے، جندروئیوں میں اپنے کام کی وجہ سے بہت مقبول تھا۔ علاقے میں چلنے والے جندروں میں سے جب بھی کوئی جندر خراب ہوتا، اسے ٹھیک کرنے کے لیے اسی کی خدمات حاصل کی جاتیں۔ وہ جندر کے ہر حصے کے کل پرزوں کا کام جانتا تھا یہاں تک کہ اسے یہ بھی پتا تھا کہ ندی جوڑیاں یا ندی نیلاں کے کس حصے میں، کس موسم میں، کتنا پانی ہوتا ہے اور اس کے لیے کتنے ہلکے یا بھاری پاٹ سے کام چلایا جا سکتا ہے۔ وہ عمر میں مجھ سے ایک آدھ سال ہی بڑا ہے اور میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں، جب میرے بچپن میں وہ اپنے باپ کے ساتھ، ہمارا جندر ٹھیک کرنے آیا کرتا تھا۔ اپنی نوجوانی کے دنوں میں جب میں نے جندر کے ساتھ کتابوں کے لیے الگ سے کمرہ بنانے کا پروگرام بنایا تھا تو اس کی پیائش کرنے وہی آیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسی کام میں گزارا، لیکن بعد میں جب آس پاس کے دیہات میں بجلی سے چلنے والی چکیاں نصب ہونے لگیں اور جندروں کا کام ٹھپ ہونے لگا تو اس کا کام دھندا بھی ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ وہ آخری بار سولہ سترہ سال پہلے میرا جندر ٹھیک کرنے آیا تھا، چوں کہ جندر کے چھوٹے موٹے کام میں خود بھی کر سکتا ہوں اس لیے اس کے بعد اول تو مجھے کبھی اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی اور اگر پڑی بھی تو یہ سوچ کر کہ اب وہ اس پیشے کو ترک کر چکا ہے اور معلوم نہیں اس کے پاس ضروری اوزار ہیں بھی یا نہیں میں نے اسے کبھی زحمت

نہیں دی لیکن اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ برسوں بعد میں نے جب اس کے گھر میں قدم رکھا تو مجھے لگا جیسے گزرتے وقت کا ہر ہر لمحہ اس کے چہرے پر جھریوں کی صورت میں نقش ہے۔ البتہ اس کا مکان اب بھی ویسا ہی تھا جیسا میں نے پندرہ سولہ سال پہلے دیکھا تھا؛ خستہ اور خراب حال۔ اس کی نظر بھی بہت کمزور ہو چکی تھی۔ جب میں نے اپنا تعارف کرایا تو اس نے ''ولی خان تم۔'' کا آوازہ بلند کیا اور خوشی کے مارے مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ جب اس نے آنے کی وجہ دریافت کی اور میں نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا تو کچھ دیر تو وہ بھونچکا سا ہو کر یوں میرا منہ دیکھتا رہا جیسے اس پر میرا پاگل پن آشکار ہو چکا ہو۔ اگرچہ اس نے مروت میں آکر اس کا اظہار نہیں کیا مگر میں نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ایسا ہی سمجھ رہا ہے۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ میں پاگل نہیں ہوں بس میری مجبوری یہ ہے کہ مجھے جندر کی کوک سنے بغیر نیند نہیں آتی۔ وہ میرے ساتھ چل پڑا مگر میں نے دیکھا کہ وہ کچھ خوف زدہ سا ہے۔ اس کا خوف دور کرنے کے لیے میں نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ اسے وہ دن یاد دلائے جب وہ میرے جندر پر آیا کرتا تھا اور ہم دونوں دیر تک خوش گپیوں میں مصروف رہا کرتے تھے۔ میں نے اسے اس کے سنائے ہوئے لطیفے بھی یاد دلائے تاکہ اس کا شک دور ہو جائے۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ کہیں راستے ہی سے نہ کھسک جائے اور میرا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ جائے۔

جندر پر پہنچتے ہی اس نے اپنا کام شروع کر دیا اور سورج ڈھلنے سے پہلے پہلے اس نے اوپر والے پاٹ کا مستقل طور پر ایسا بندوبست کر دیا کہ اوپر والا پاٹ نچلے پاٹ سے رگڑ کھائے بغیر ہی گھومتا رہے۔ میں نے جب اسے مزدوری دینے کی کوشش کی تو اس نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ ''اب پندرہ سال سے میرا اس کے بغیر بھی گزارہ چل رہا ہے۔ اب مجھے مانگ کر کھانے میں عار محسوس نہیں ہوتی اور تم ابھی اس کے عادی نہیں ہوئے۔ خالی پیٹ بھی نیند نہیں آتی۔ سو میری طرف سے رکھ لو ممکن ہے کبھی تمھارے کام آئیں۔'' میں نے بھی زیادہ اصرار نہیں

کیا اور آبدیدہ آنکھوں سے اسے رخصت کیا۔ یوں جندر ایک مرتبہ پھر کوکنے لگا اور اس کی کوک مجھے اپنے دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی ہوک کی طرح محسوس ہونے لگی اور یوں میں ایک طرح کی خود اذیتی کا شکار ہوتا چلا گیا جس نے رفتہ رفتہ مجھے نڈھال کرنا شروع کر دیا۔

اور اب یہ حال ہے کہ مسلسل بے خوابی کی وجہ سے میری بھوک مکمل طور پر مٹ چکی ہے اور گزشتہ تین دن سے میں نے حلق سے ایک نوالہ بھی نہیں اتارا، صرف پانی پر گزارہ چل رہا ہے؛ میرا بھی اور جندر کا بھی۔

مجھے اب بھی یقین ہے کہ اگر کہیں سے کوئی چونگ میسر آ جائے اور میں جندر کی وہی سریلی گونج دوبارہ سن سکوں تو میرا ماس، جو گزشتہ پینتالیس دنوں میں خالی گھومتے جندر کی کوک نے میری ہڈیوں سے علاحدہ کر دیا ہے، دوبارہ ہڈیوں سے جڑنا شروع ہو جائے گا، میری کھوئی ہوئی طاقت بحال ہونا شروع ہو جائے گی اور میں دوبارہ جی اٹھنے لگوں گا لیکن اب اس قسم کی کوئی امید بے کار ہے کہ اگر گاؤں میں لگی مشینی چکی، ابھی اور اسی لمحے، بھک سے اُڑ جائے تو بھی رات کے اس آخری پہر میں کوئی یہاں آنے سے رہا اور ابھی کچھ دیر بعد جب پو پھٹے گی تو پانی سر سے گزر چکا ہوگا۔

میری معدوم ہوتی یادداشت میں، پینتالیس دن پہلے کا وہ لمحہ اب بھی پوری طرح نقش ہے، جب چونگ پیس کر جندر کی کیل اٹھاتے ہوئے میرے ذہن میں یہ خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا تھا کہ میں اپنی اور جندر کی زندگی کی آخری چونگ پیس چکا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جب قیامت کے دن مجھے اٹھایا جائے گا تو میری یادداشت میں سب سے پہلے یہی منظر ابھرے گا۔۔۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس خیال کے آتے ہی میں نے پیچھے مڑ کر ایک نظر، دروازے کے اس پار سامنے والی پہاڑی پر ڈالی تھی، جہاں ڈھلتے ہوئے سورج کی کرنوں نے پیلاہٹ پھیلا رکھی تھی اور مجھے یوں لگا تھا جیسے سورج کوہ مل کے پہاڑوں کے پیچھے نہیں میرے دل میں ڈوب رہا ہے۔ جوں جوں سورج ڈوبتا جا رہا تھا اور شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے، مجھے اپنا وجود پھیلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جب سورج کی آخری کرنیں پہاڑی کی چوٹی پر موجود کاہُو کے سب سے بلند و بالا درخت کی آخری پھننگوں پر سے آہستہ آہستہ غائب ہو رہی تھیں، مجھے لگا جیسے سورج میرے دل کے کسی نہاں خانے میں گم ہونے کو ہے اور میرے وجود کا سایہ کائنات کی ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ اگلے کچھ ہی لمحوں میں ساری کائنات میرے وجود کے اندھیرے میں گم ہو چکی تھی۔ میں ساری رات جندر کے رکے ہوئے پاٹ کے سامنے تھلے پر بیٹھا اپنے وجود کی گہرائیوں میں گم ہو چکی کائنات کو ٹٹولتا رہا تھا۔

اگلی صبح سورج مشرقی پہاڑی کی چوٹی سے نہیں میرے معدوم ہوتے وجود کی گہرائیوں سے ابھرا تھا۔ جوں ہی کائنات پر سے میرے وجود کا سایہ چھٹا میں اُٹھا اور جندر کے پچھواڑے جا کر لکڑی کا پشتہ جو پرنالے کے اوپر والے سرے میں پیوست تھا کھینچ کر نکالا اور دوسری طرف والی نالی میں گھسیڑ دیا۔ جوں ہی پانی کی دھار نے چرخے کو چھوا جندر کی ہوک مجھے پانی کے شور میں بھی سنائی دینے لگی۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا واپس آیا اور جوں ہی جندر کی دہلیز پر قدم رکھا، مجھے لگا جیسے یہ درد بھری ہوک میرے اندر سے اٹھ رہی ہے۔

مجھے ایک درد بھری سرشاری ہوئی، ویسی ہی سرشاری جیسی خود اذیتی کے شکار لوگوں کو ہوتی ہے لیکن میں اس خود اذیتی سے زیادہ دیر لطف اندوز نہ ہو سکا جلد ہی مجھے جندر کے پچھواڑے جا کر پانی موڑنا پڑا کہ اوپر والے پاٹ کے ساتھ لکڑی کی وہ کیل جسے کھینچنے سے اوپر والا پاٹ اپنے معمول سے تھوڑا سا اوپر اُٹھ کر نچلے پاٹ سے رگڑ کھائے بغیر گھومتا رہتا ہے، یک دم ٹوٹ گئی اور دونوں پاٹوں کی آپس میں رگڑ کی وجہ سے کمرے میں اتنی گرد اور بو پھیل گئی کہ وہاں ٹکنا محال ہو گیا۔ اس روز میں ساری رات کوئی ایسی صورت نکالنے کے منصوبے بناتا رہا کہ جندر کے دونوں پاٹ آپس میں رگڑ کھائے بغیر مستقل گھومتے رہیں۔